ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان



سہ ماہی

تحقیقات اسلامی

علی گڑھ

قرآن مجید - اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے
سید جلال الدین عمری
امام ابن اسحٰقؒ - شاہ ولی اللہؒ کے اہم ترین ماخذ سیرت
پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
بوڑھوں کے عافیت کدے اور اسلام
ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
رویتِ ہلال - ایک تحقیقی جائزہ
مولانا کلیم اللہ عمری مدنی
مولانا فتح محمد جالندھریؒ بہ حیثیت مترجم قرآن
جناب محمد سلیم اسماعیل
نواب صدیق حسن خاں کی کتاب الحطہ
مولانا جاوید احسن فلاحی
قرآن کریم اور فرضی داستانیں
پروفیسر سید احتشام احمد ندوی
ڈاکٹر محمود حسن الٰہ آبادی
تعارف وتبصرہ
محمد رضی الاسلام ندوی
مولانا محمد جرجیس کریمی

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اپریل ——— جون ۲۰۱۲ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

Nabi Nagar (Jamalpur) P.O.Box: 93,ALIGARH-202002 (INDIA)

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۳۱ شمارہ: ۲

جمادی الاولیٰ ——— رجب ۱۴۳۳ھ

اپریل ——— جون ۲۰۱۲ء

تحقیقاتِ اسلامی کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر ملاحظہ کریں

ادارتی امور

موبائل : 09582050234

ای میل : tahqeeqat@gmail.com

mrnadvi@yahoo.com

انتظامی امور

فون : 0571-2902034

موبائل: 09897655171

ای میل: tahqeeqateislami@gmail.com

tahqeeqat_islami@yahoo.com

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۳۰ روپے
سالانہ	۱۲۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۵۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۵۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۲۵ ڈالر امریکی

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۳۰ ڈالر امریکی

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپواکر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

قرآن مجید- اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

امام ابن اسحٰقؒ -شاہ ولی اللہؒ کے اہم ترین ماخذ سیرت — پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی — ۱۹

بحث ونظر

بوڑھوں کے عافیت کدے اور اسلام — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۳۹

رؤیتِ ہلال- ایک تحقیقی جائزہ — مولانا کلیم اللہ عمری مدنی — ۵۱

سیر وسوانح

مولانا فتح محمد جالندھریؒ بہ حیثیت مترجم قرآن — جناب محمد سلیم اسماعیل — ۷۷

مطالعۂ کتاب

نواب صدیق حسن خاں کی کتاب الحطّہ — مولانا جاوید احسن فلاحی — ۸۹

نقد واستدراک

قرآن کریم اور فرضی داستانیں — پروفیسر سید احتشام احمد ندوی — ۱۰۳

وضاحت — ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی — ۱۰۷

تعارف وتبصرہ

برصغیر ہند میں علوم فقہ اسلامی کا ارتقاء — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۰۹

اخوان المسلمون: تزکیہ، ادب، شہادت — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۱۱۲

عصر حاضر کی نفسیاتی الجھنیں — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۵

کتابیات شبلی — ،، ،، ،، — ۱۱۶

خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۳۹) — ۱۱۹

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
سابق ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل، ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

۲۔ مولانا کلیم اللہ عمری مدنی
استاد جامعہ دارالسلام عمرآباد

۳۔ جناب محمد سلیم اسماعیل
جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد (پاکستان)

۴۔ مولانا جاوید احسن فلاحی
ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات (سنی)، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

۵۔ پروفیسر سید احتشام احمد ندوی
مدینہ منزل، نیوسرسید نگر، علی گڑھ

۶۔ ڈاکٹر محمود حسن الٰہ آبادی
بی-۱۰۴، بدر منزل، پٹیل نگر، بھیونڈی (مہاراشٹرا)

۷۔ مولانا محمد جرجیس کریمی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۸۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
معاون مدیر سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ

۹۔ سید جلال الدین عمری
صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

حرف آغاز

قرآن مجید ـــــ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے

سید جلال الدین عمری

بعض لوگ قرآن مجید کی تعریف وتوصیف کرتے ہیں۔ بہ ظاہر اس کا احترام بھی کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کا تصورِ مساوات، اس کا نظامِ معاشرت، قیامِ عدل پر اس کا زور اور اس جیسی بعض دوسری تعلیمات کو قرآن کا احسان مانتے ہیں اور دنیا پر اس کے اثرات کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن اسے وہ حضرت محمد ﷺ کی فکری کاوشوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں کہ آپ نے دنیا کو قرآن جیسی کتاب دی۔ انتہائی ناموافق حالات میں عرب کے ناخواندہ، غیر مہذب اور جنگ جو قبائل کو متحد کر کے ایک عظیم مذہبی اور تہذیبی انقلاب برپا کر دیا اور عدل وانصاف اور اخوت ومساوات کی بنیاد پر ایک وسیع سلطنت قائم کردی۔ بعض لوگوں کی زبان سے برملا اس بات کا اعتراف واظہار بھی ہوتا رہتا ہے کہ آپ تاریخ عالم کے سب سے بڑے مذہبی اور سیاسی راہ نما تھے۔

اس ثنا خوانی اور تعریف وتوصیف میں قرآن مجید اور حضرت محمد ﷺ کی اصل حیثیت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ آپ دنیا کے سیاسی قائدین یا مصلحین کی طرح سیاسی قائد یا مصلح نہیں تھے، جو اپنی فکر کے مطابق نوعِ انسانی کی خدمات انجام دیتے ہیں، بلکہ آپ کی اصل حیثیت یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ آپ نے دنیا میں جو کارنامہ انجام دیا وہ اسی حیثیت میں انجام دیا۔

عرب کے مشرکین سے قرآن نے سب سے پہلے خطاب کیا۔ وہ محمد ﷺ کی سیرت واخلاق اور دیانت وامانت کے معترف تھے، لیکن بنائے نزاع آپ کی رسالت اور قرآن مجید تھا۔ وہ آپ کے اس دعویٰ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ آپ اللہ

تعالیٰ کے رسول ہیں اور اللہ ہی کی جانب سے آپ پر قرآن مجید نازل ہو رہا ہے۔

قرآن مجید کی متعدد سورتوں کے آغاز ہی میں یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے، جو محمد ﷺ پر نازل کی گئی ہے۔ یہاں صرف دو تین حوالے پیش کیے جا رہے ہیں۔ بعض اور حوالے آگے اسی مضمون میں موجود ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَ لَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا ○ (الکہف:۱)

حمد تمام کی تمام اللہ کے لیے ہے، جس نے اپنے بندے پر 'الکتاب' (قرآن) نازل کی اور اس میں کسی قسم کی کجی نہیں رکھی۔

تَنزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ (الزمر:۱)[1]

اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے، جو غالب اور حکمت والا ہے۔

الٓرٰ ○ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ○ (ہود:۱،۲)

الٓرٰ۔ یہ ایسی کتاب ہے، جس کی آیات (دلائل کے لحاظ سے) محکم کی گئی ہیں، پھر ان کی تفصیل کی گئی ہے، اس ذات کی طرف سے جو حکیم اور ہر چیز سے باخبر ہے۔

قرآن میں بار بار زور دے کر کہا گیا ہے کہ یہ باعظمت کتاب اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسے کسی انسان کی طرف منسوب کرنا غلط ہے۔ اس کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جا سکتا جو کسی انسانی تصنیف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

سورۃ القدر کی پہلی ہی آیت ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃُ الْقَدْرِ ○ (القدر:۱)

بے شک ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔

سورۂ دخان ان آیات سے شروع ہوتی ہے:

حٰمٓ ○ وَ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ○ اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ ○ (الدخان:۱-۳)

حٰمٓ، قسم ہے اس واضح کتاب کی۔ بے شک ہم نے اس کو ایک مبارک رات میں اتارا ہے، یقیناً ہم لوگوں کو انجام بد سے ڈرانے والے ہیں۔

---

[1] یہ آیت الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۃ المؤمن:۱،۲، اور سورہ حٰمٓ السجدۃ:۱،۲ کے آغاز میں بھی آئی ہے۔

سورۂ دہر میں ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا○ (الدھر:۳۲) ہم نے یہ قرآن تم پر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔

سورۂ رحمٰن کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ○ (الرحمٰن:۱،۲) خدائے رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی ہے۔

سورۂ زمر کی ابتدا ہی میں فرمایا گیا:

تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ○ اِنَّآ اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصاً لَّہُ الدِّیْنَ○ (الزمر:۱،۲) یہ کتاب نازل کردہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہر چیز پر غالب اور حکمت والا ہے، ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے، لہٰذا آپ اللہ کی عبادت کریں، دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔

اسی سورت میں آگے ارشاد ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ○ (الزمر:۴۱) ہم نے آپ پر یہ کتاب لوگوں (کی ہدایت) کے لیے دین حق کے ساتھ نازل کی ہے۔

یہ بات اس زور اور قوت کے ساتھ اس لیے کہی گئی کہ اسے تسلیم کیے بغیر محمد ﷺ اور قرآن مجید کی صحیح حیثیت کا تعین ہی نہیں کیا جا سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کے مخالفین کہتے تھے کہ قرآن مجید آپ کے خیالاتِ پریشان کا مجموعہ ہے، جسے آپ اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ قرآن مجید میں بار بار اس کی تردید کی گئی اور کہا گیا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے، جسے انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ سورۂ سجدہ کے شروع ہی میں ہے کہ تم اپنے انجام سے بے خبر تھے، صدیوں سے تمھارے درمیان اللہ کے کسی رسول کی ـــــ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد ـــــ بعثت نہیں ہوئی تھی۔ اب اس مقصد کے لیے محمد ﷺ پر قرآن نازل ہوا ہے۔ وہ اس کے ذریعے تمھیں دنیا اور آخرت کی فلاح کی راہ دکھا رہے ہیں:

الٓمّٓ ○ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ○ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰهُ بَلۡ هُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ لِتُنۡذِرَ قَوۡماً مَّآ اَتٰهُمۡ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ لَعَلَّهُمۡ یَهۡتَدُوۡنَ○ (السجدۃ:۱-۳)

الٓمّٓ ۔اس کتاب کا نزول،اس میں کوئی شک نہیں کہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص (پیغمبرؐ) نے اسے خود سے گھڑ لیا ہے؟ (نہیں)، بلکہ وہ تمھارے رب کی طرف سے برحق نازل ہوئی ہے، تاکہ تم ایک ایسی قوم کو اس کے انجام سے آگاہ کردو جس کے پاس تم سے پہلے کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا تھا، شاید وہ راہِ ہدایت پاسکیں۔

سورۂ فرقان کے شروع ہی میں کہا گیا کہ قرآن مجید کا نزول اس لیے ہے کہ ساری دنیا جہاں کے لوگوں کو ان کے انجام سے متنبہ کردیا جائے:

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِهٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرًا○ (الفرقان:۱)

بابرکت ہے وہ ذات جس نے حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب (قرآن) اپنے بندے پر نازل کی، تاکہ وہ سارے جہاں والوں کے لیے نذیر ہو۔(ان کے انجام سے انہیں آگاہ کردے)

سورۂ ابراہیم کے آغاز میں یہ بات زیادہ وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے:

الٓرٰ ۟ کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَیۡکَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ○ اللّٰهِ الَّذِیۡ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ وَ وَیۡلٌ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِۨ○ (ابراہیم:۱،۲)

الٓرٰ ۔یہ ایک کتاب ہے، جو ہم نے تم پر نازل کی ہے، تاکہ تم لوگوں کو ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں پہنچاؤ، ان کے رب کی توفیق سے۔ اس رب کے راستے پر جو زبردست اور ستودہ صفات ہے۔ وہ اللہ جو ان ساری چیزوں کا مالک ہے، جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور تباہی ہے سخت عذاب کی انکار کرنے والوں کے لیے۔

سورۂ شعراء میں کہا گیا کہ اس کتاب کا نزول اس اعلیٰ وارفع مقصد کے لیے ہوا ہے، جس کے لیے اللہ کے رسولوں کی بعثت ہوتی رہی ہے:

وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ○ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ○ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ○ (الشعراء:۱۹۲-۱۹۵)

بے شک یہ قرآن رب العالمین کا نازل کردہ ہے جسے ایک امانت دار فرشتہ لے کر تمھارے قلب پر اترا ہے، تاکہ تم (پیغمبروں کی طرح) اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے ہوجاؤ (اس مقصد کے لیے) یہ صاف صاف عربی زبان میں ہے۔

قرآن کے منکرین کبھی اسے شاعری قرار دیتے اور کبھی کہتے کہ یہ کہاوت اور جادوگری ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ○ وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلاً مَّا تُؤْمِنُوْنَ ○ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلاً مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (الحاقۃ:۴۰-۴۳)

بے شک یہ ایک معزز رسول کا قول ہے۔ اور وہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے، کم ہی تم (اس پر) ایمان لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے، کم ہی تم نصیحت حاصل کرتے ہو۔ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔[1]

---

[1] آیت میں 'رسول کریم' کے الفاظ آئے ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس سے حضرت جبرئیل مراد ہیں، لیکن آیات کا سیاق وسباق بتا رہا ہے کہ یہاں اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کا ذکر ہے۔ بعد کی آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ زمخشری کہتے ہیں: **ان هٰذا القرآن لقول رسول كريم اى يقوله و يتكلم به على وجه الرسالة من عند الله.** اس کے بعد کہتے ہیں: **وقيل الرسول الكريم جبريل عليه السلام و قوله و ما هو بقول شاعر دليل على انه محمد ﷺ و ان المعنى على اثبات انه رسول لا شاعر و لا كاهن.** الکشاف: ۴/۴۹۵ (یعنی یہ قرآن، رسول کریم کا قول ہے۔ یہ کلام وحی ورسالت ہے جو اللہ کی طرف سے آپ تک پہنچا ہے، اسی کو آپ پیش کر رہے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے حضرت جبرئیل مراد ہیں، لیکن بعد کی آیت کہ یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں محمد ﷺ کی رسالت کا اثبات ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں شاعر یا کاہن نہیں ہیں)۔

قرآن مجید ایک پرتاثیر کلام ہے، دل اس کی طرف خود بخود کھینچتا ہے۔اس کے اس جذب وتاثیر کی وجہ سے مخالفین اسے سحر اور جادو کہا کرتے تھے۔سورۂ صٓ کی ابتدائی آیات کے بعد فرمایا گیا:

وَعَجِبُوا أَن جَاءهُم مُّنذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُونَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ○ (ص:۴)

اورانھوں نے اس پر تعجب کیا کہ ان ہی میں سے ایک ڈرانے والا ان کے پاس آیا۔اور انکار کرنے والوں نے کہا کہ یہ تو ساحر اور (دعویٰ رسالت میں) جھوٹا ہے۔

سورۂ صافات میں ہے:

وَ قَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○

اوروہ کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔

(الصّٰفّٰت:۱۵)

مخالفین کبھی یہ کہتے کہ قرآن مجید کی ترتیب و پیش کش میں محمد ﷺ کو کچھ دوسرے لوگوں کا تعاون حاصل ہے۔قرآن مجید میں عبرت اور نصیحت کے لیے تاریخی واقعات اور تمثیلات بیان ہوئی ہیں۔اس کے متعلق کہا جاتا کہ ان قصے کہانیوں کو محمد ﷺ دوسروں سے نقل کراتے ہیں، وہ آپ کو سنائے جاتے ہیں اور آپ انہیں وحی کے نام سے دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔قرآن نے اسے سراسر ظلم اور ناانصافی قرار دیا:

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ نِ افْتَرٰهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْماً وَّ زُوْرًا ○ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلاً ○ (الفرقان:۴،۵)

جن لوگوں نے انکار کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ تو محض ایک جھوٹ ہے، جسے اس شخص نے گھڑ لیا ہے اور اس معاملہ میں کچھ دوسرے لوگ اس کی مدد کرتے ہیں۔ بے شک یہ لوگ (بڑے ہی) ظلم اور جھوٹ کا ارتکاب کررہے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ اگلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں، جنھیں اس شخص نے لکھوالیا ہے۔اور وہ صبح و شام اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید نے اس الزام کو کہ اس کی تصنیف میں کچھ لوگ مدد کر رہے ہیں سراسر ظلم اور جھوٹ اس لیے قرار دیا کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ اتنا بڑا واقعہ پیش آتا اور مکہ کی آبادی اس سے بے خبر ہوتی۔ مکہ کی چھوٹی سی بستی میں وہ فرد یا افراد پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے جو اس ناپاک مہم میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد قرآن کی اصل حیثیت واضح کی گئی:

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۝ (الفرقان:٦)

ان سے کہو کہ اس قرآن کو اس ذات نے نازل کیا ہے، جو آسمانوں اور زمین میں پوشیدہ امور کو جانتا ہے۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

کبھی کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ محمد ﷺ کے پاس وحی لے کر نہیں آیا ہے، بلکہ ایک غلام، جو صحفِ سماوی سے واقف ہے، آپ کو اس کی تعلیم دے رہا ہے۔ اس سلسلے میں وہ حویطب بن عبد العزیز کے غلام، جس کا نام عائش یا یعیش تھا، کا ذکر کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام کو سمجھنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ بعد میں اسلام لے بھی آیا۔ اس کے علاوہ دو اور عجمی غلاموں کا نام بھی لیا جاتا ہے کہ وہ توریت اور انجیل پڑھا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا ان کی مجلس سے کبھی گزر ہوتا تو آپ ان کی باتیں سننے کے لیے کچھ دیر رک جاتے۔ آپ کی تعلیمات کو ان کی طرف منسوب کرنا انتہائی حماقت تھی۔ اس کے لیے تعلیم و تعلّم کا طویل سلسلہ ثابت کرنا ہوگا، جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ قرآن نے کہا: جس فرد کا تم ذکر کرتے ہو وہ تو عجمی ہے، وہ اس کتاب کی تعلیم کیسے دے سکتا ہے، جس کی 'عربی مبین' کا جواب پیش کرنے سے تم سب قاصر ہو۔[1]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: زمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل: ۳۱۰/۲ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن جلد ۵، جزء ۱۰، ص ۱۱۷

وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِّسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ○ (اَلنحل:۱۰۳)

ہم بہ خوبی جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسے ایک شخص تعلیم دیتا ہے (لیکن) جس کی طرف یہ بات منسوب کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور قرآن کی زبان 'عربی مبین' ہے۔

رسولِ خدا محمد ﷺ کا مذاق اڑایا جاتا کہ آپ ہی اللہ کے رسول اور فرستادہ ہیں اور آپ ہی پر اس نے اپنی کتاب نازل کی ہے۔ آپ ہی ہیں جو ہمارے معبودوں کو بے اصل اور ان کی پرستش کو غلط قرار دے رہے ہیں اور ایک رحمٰن ورحیم کی بندگی کی دعوت دے رہے ہیں:

وَ اِذَا رَاٰکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ یَّتَّخِذُوْنَکَ اِلَّا هُزُوًا اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْکُرُ اٰلِهَتَکُمْ وَ هُمْ بِذِکْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ کٰفِرُوْنَ○ (الانبیاء:۳۶)

وہ لوگ جنھوں نے انکار کی روش اختیار کر رکھی ہے وہ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ کو مذاق بنا لیتے ہیں۔ کیا یہی وہ شخص ہے جو تمھارے معبودوں کا ذکر کیا کرتا ہے اور یہ (خدائے) رحمٰن کے ذکر کے منکر ہیں۔

یہی بات ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

وَ اِذَا رَاَوْکَ اِنْ یَّتَّخِذُوْنَکَ اِلَّا هُزُوًا اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلاً ○ اِنْ کَادَ لَیُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْهَا○ (الفرقان:۴۱،۴۲)

جب وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو بس مذاق بنا لیتے ہیں کہ کیا یہی ہے وہ شخص جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ یہ تو ہمیں اپنے معبودوں سے بھٹکا ہی دیتا اگر ہم ان کے سلسلے میں جمے نہ رہتے۔

قرآن مجید میں ان کی بے سر و پا باتوں کا جواب نہ دیا جاتا یا کسی مسئلہ میں نزولِ وحی میں تاخیر ہوتی تو مذاق اڑاتے کہ اس کی تصنیف میں آخر تاخیر کیوں ہو رہی ہے، جس طرح قرآن گھڑ کر پیش کرتے ہو اس طرح اس کا بھی کوئی جواب لے آؤ:

وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا[1] جب آپ ان کو کوئی آیت نہ پیش کریں تو کہتے ہیں کہ اسے اپنی طرف سے گھڑ کیوں نہیں لیا؟

اس کے جواب میں کہا گیا:

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ○ (الاعراف:۲۰۳) ان سے کہو کہ میں تو اس وحی کی اتباع کرتا ہوں، جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر کی جاتی ہے۔ یہ بصیرتیں (دلائل) ہیں اور ہدایت اور رحمت ہے، ان کے لیے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

مخالفین کے تمام لغو اعتراضات، بے ہودہ الزامات اور شکوک وشبہات کے جواب میں کہا گیا کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن جن علوم ومعارف کا حامل ہے آپ کو اس کی علمی وفکری تیاری کرتے کسی نے نہیں دیکھا، اس کے لیے آپ نے کسی فلسفی اور دانش ور کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ آپ ایک سادہ سی اور با اخلاق زندگی گزار رہے تھے، آپ اس سے بالکل بے خبر تھے کہ آپ اللہ کے رسول بنائے جائیں گے۔ وحی ورسالت آپ کے لیے اچانک ایک ایسا تجربہ تھا، جس کا آپ تصور تک نہیں کرتے تھے:

وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ○ (القصص:۸۶) اور آپ اس بات کی توقع نہیں کرتے تھے کہ آپ پر (آسمانی) کتاب اتاری جائے گی۔ مگر یہ آپ کے رب کی مہربانی ہے (کہ اس نے یہ کتاب نازل کی) لہٰذا آپ منکرین کے مددگار نہ بنیے۔

---

[1] بعض حضرات نے یہاں 'آیت' سے معجزہ مراد لیا ہے، لیکن سیاق وسباق سے قریب تر یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہاں آیت قرآنی مراد ہے۔ آیت کی تفسیر کے لیے ملاحظہ ہو: زمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل:۲/۱۸۵۔ بیضاوی: ۱/۶/۳۷۔ شوکانی کی تفسیر کی تلخیص زبدۃ التفسیر من فتح القدیر کی عبارت ہے: کانوا یقولون اذا تراخی الوحی ھلا اتیت بشیء من الآیات القرآنیۃ اقتعالا من تلقاء نفسک، ص:۲۲۵

سورۂ شوریٰ کے آخر میں کہا گیا کہ رسالت سے پہلے آپ کسی آسمانی کتاب سے اور ایمان اور اس کے تقاضوں سے واقف نہیں تھے۔ منصبِ رسالت پر سرفراز ہونے کے بعد ہی یہ حقائق آپ پر کھلے:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَ اِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ○ (الشوریٰ:۵۲)

اور اسی طرح ہم نے آپ پر اپنے حکم سے ایک روح (قرآن) کی وحی کی ہے، جب کہ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنایا۔ اس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔ بے شک آپ سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کر رہے ہیں۔[1]

سورۂ نمل میں زور دے کر کہا گیا:

وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ○ (النمل:۶)

بے شک یہ قرآن آپ اس خدا کی طرف سے پا رہے ہیں جو حکمت والا اور علم والا ہے۔

اس طرح قرآن مجید نے اس تصور ہی کو ختم کر دیا کہ وہ محمد ﷺ کی تصنیف ہے۔ اس پر جو اعتراضات کیے جاتے یا جو شکوک و شبہات پیدا کیے جاتے تھے ان سب کی ایک ایک کر کے تردید کی۔ اس نے بتایا کہ آپ کی پاکیزہ سیرت، آپ کا بے داغ

---

[1] آیت میں 'روح' کا لفظ آیا ہے۔ اس سے نبوت، رحمت، وحی، جبرئیل اور قرآن مراد لیے گئے ہیں۔ (بغوی، معالم التنزیل، مع تفسیر الخازن: ۵/ ۳۹۱، ۳۹۲۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد۸، جزء۱۶، ص ۳۷) ابن کثیر اور جلالین وغیرہ میں روح کی تشریح قرآن سے کی گئی ہے۔ زمخشری اس کی تفسیر میں کہتے ہیں رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا یرید ما او حی الیه لان الخلق یحیون به فی دینهم کما یحیی الجسد بالروح۔ الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل: ۴/ ۲۲۷۔ یعنی 'رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا' سے مراد وہ وحی ہے، جو آپ کو کی جا رہی ہے۔ اسے روح اس لیے کہا گیا کہ اس سے اللہ کے بندے حیات دینی پاتے ہیں، جس طرح روح کے ذریعے جسم کو حیات ملتی ہے۔

ماضی، آپ کا آسمانی تعلیمات سے ناواقف ہونا ثابت کرتا ہے کہ قرآن مجید آپ کی من گھڑت یا ذہنی اختراع نہیں ہے۔ یہ شاعری، ساحری یا داستان سرائی بھی نہیں، بلکہ کتاب ہدایت ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے، اسے اسی حیثیت سے قبول کرنا ہوگا۔

موجودہ دور کے دانشور اور محققین جو قرآن مجید کو محمد ﷺ کی تصنیف قرار دیتے ہیں انہیں یہ کہنے میں تامل نہیں ہوتا کہ قرآن کی تعلیمات اپنے دور کے لیے تو مناسب تھیں، لیکن اب ان کی معنویت باقی نہیں رہی۔ فلاں موضوع پر اس کے خیالات میں وزن ہے اور فلاں موضوع پر اس نے بے وزن باتیں کہی ہیں۔ اس کی یہ تعلیم درست اور یہ تعلیم نادرست ہے۔ اسے اس حد تک قبول کیا جاسکتا ہے اور اس سے آگے وہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس معاملہ میں اس پر عمل ہوسکتا ہے اور اس معاملہ میں عمل ممکن نہیں ہے۔ یا یہ کہ اس کا تصورِ مساوات ناقص ہے اور اس میں انسانی حقوق کی پاس داری نہیں ہے۔ اس طرح کی باتیں کسی بھی انسان کی ذہنی کاوش کے بارے میں کہی جاسکتی ہیں۔

اہل عرب جو رسول اللہ ﷺ کے دعویِ رسالت کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے اور قرآن مجید کو آپ کی تصنیف قرار دیتے تھے، وہ بھی یہی کہتے تھے کہ قرآن جس عقیدۂ توحید کی دعوت دے رہا ہے، آخرت کا جو تصور پیش کر رہا ہے، جن اخلاقیات اور اصولِ حیات کا پابند بنانا چاہتا ہے، وہ ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہیں۔ ہمارے عقیدہ اور مذہب، ہماری تہذیب اور روایات سے یہ ہم آہنگ ہو یا کم از کم اس کی رعایت کی جائے تو اس پر غور ہوسکتا ہے۔

اس مطالبہ کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ مطالبہ قرآن کے موقف کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کیا جارہا ہے۔ محمد ﷺ قرآن کے مصنف یا مرتب نہیں ہیں کہ وہ اس میں اپنی مرضی سے کمی بیشی یا حذف و اضافہ کرسکیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ وہ اس کے احکام اور ہدایات کے پابند ہیں:

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآیِٔ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ (یونس:۱۵)

جب ان کو ہماری واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو اس کی امید نہیں ہے کہ (انہیں قیامت میں) ہم سے ملنا ہے وہ کہتے ہیں کہ تم کوئی دوسرا قرآن پیش کرو یا اسے تبدیل کردو۔ ان سے کہو کہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے کہ اس میں کوئی ردوبدل کردوں۔ میں تو بس اس وحی کی اتباع کرتا ہوں، جو مجھ پر کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن (قیامت) کے عذاب کا ڈر ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی کوئی بات خدا کی طرف منسوب کر کے پیش کریں گے تو وہ اس کی گرفت میں آجائیں گے۔ تمھاری طاقت نہیں ہے کہ تم ہمیں اس سے روک دو اور اپنے تمام وسائل و ذرائع کے باوجود انہیں بچا سکو:

وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ ○ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ ○ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِیْنَ ○ (الحاقة:۴۴-۴۷)

اگر وہ ہماری طرف کوئی بات گھڑ کر منسوب کرتا تو ہم اسے دائیں ہاتھ (قوت) سے پکڑ لیتے۔ پھر اس کی رگِ گردن کاٹ ڈالتے اور تم میں سے کوئی ایسا نہ ہوتا جو اسے بچالے جائے۔

کسی انسانی تصنیف کے بارے میں تو یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کی تمام باتوں سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا، فلاں مسئلہ میں اس کا نقطۂ نظر صحیح ہے اور فلاں مسئلہ میں صحیح نہیں ہے۔ یہ بات واقعہ کے مطابق بھی ہوسکتی ہے، اس لیے کہ انسان کا علم وفہم ناقص ہے، اس سے غلطیاں ہوسکتی ہیں اور ہوتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی کتاب کے بارے میں رد وقبول کا یہ حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اس کے ایک جزء سے اتفاق اور دوسرے جزء سے عدم اتفاق کا رویہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ کی کتاب یہی نہیں کہ مکمل اتباع کا مطالبہ کرتی ہے، بلکہ مخالف افکار ونظریات سے کلی اجتناب کا حکم دیتی ہے، اس لیے کہ علم وبصیرت پر ان کی اساس نہیں ہے، بلکہ ظن وتخمین اور خواہشات پر ان کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ سورۂ انعام

میں ارشاد ہے:

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ ○ (الانعام:۱۰۲)

پیروی کیجیے اس ہدایت کی جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر وحی کی جا رہی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ مشرکوں سے بے رخی اختیار کیجیے۔

اس ذیل میں آگے فرمایا:

وَاِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ○ (الانعام:۱۱۶)

اگر آپ ان میں سے اکثر کی بات پر چلنے لگیں جو زمین پر رہتے ہیں تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو محض گمان کے پیچھے چلتے ہیں اور محض اٹکل سے کام لیتے ہیں۔

سورۂ جاثیہ میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کو کتاب عطا کی تھی، لیکن بعد میں وہ اپنے مفاد کی خاطر اس میں ردّ و بدل کرنے لگے اور اسے صحیح شکل میں باقی نہیں رکھا۔ اب آپ اس قانون شریعت پر عمل کیجیے جو آپ کو دیا گیا ہے، جاہلوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیے:

ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ اِنَّهُمْ لَنْ یُّغْنُوْا عَنْکَ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا وَّ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَّ اللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ ○ (الجاثیۃ:۱۸،۱۹)

پھر ہم نے آپ کو دین پر عمل کے لیے ایک شریعت دی ہے۔ آپ اس کی اتباع کیجیے اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیے جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔ وہ خدا کے مقابلہ میں آپ کے کچھ کام نہ آئیں گے۔ بے شک ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ اس سے ڈرنے والوں کا رفیق ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ عالم الغیب ہے۔

دنیا کی کوئی چیز اور اس کے پیچھے کارفرما حکمت اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ انسان کے ماضی، حال اور مستقبل سے واقف ہے اور اس کی بھلائی برائی اور فلاح وخسران کو خود اس سے زیادہ جانتا ہے۔ وہ سبوح قدوس ہے، اس سے غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے، پوری دنیا اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ وہ بے عیب اور ہر نقص اور کمزوری سے پاک ہے۔ اسے مانے بغیر اللہ کا تصور ہی مکمل نہیں ہوتا۔ اس بنیاد پر وہ کہتا ہے کہ اس کی کتاب بھی ہر نقص سے پاک ہے، اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ وہ صراطِ مستقیم کی طرف راہ نمائی کرتی ہے، زندگی کے کسی بھی معاملہ میں اس کی ہدایت کو غلط نہیں کہا جاسکتا۔ قرآن اپنی اسی حیثیت کو تسلیم کرانا چاہتا ہے۔

اسلام میں خدمت خلق کا تصور

مولانا سید جلال الدین عمری

اسلام نے خدمتِ خلق کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس کتاب میں خدمتِ خلق کی دینی حیثیت اور عبادت سے اس کا تعلق واضح کرنے کے بعد خدمت کے مختلف پہلوؤں، طریقوں اور ذرائع کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کے مستحقین کا تذکرہ ہے۔ وقتی اور ہنگامی خدمات، مستقل خدمات، رفاہی خدمات اور اس مقصد سے قائم ہونے والے اداروں اور تنظیموں کی شرعی حیثیت بیان کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں مروّج بعض غلط تصورات کی اصلاح بھی کی گئی ہے۔ وقت کے ایک اہم موضوع پر اردو میں پہلی مستند کتاب، صفحات: ۱۸۴، قیمت: =/۱۱۰ روپئے

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ Islam and service to mankind کے نام سے شائع ہوگیا ہے، صفحات: ۲۰۰، قیمت: -/۱۰۰ روپئے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر-۹۳، علی گڑھ-۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

تحقیق وتنقید

امام ابن اسحاقؒ- شاہ ولی اللہؒ کے اہم ترین ماخذِ سیرت

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

امام محمدؒ بن اسحاق بن یسار مطلبی (۸۵ھ/۷۰۴ء-۱۵۰ھ/۷۶۷ء) سیرت و حدیث کے امام تھے۔ ان کے معاصرین اور متاخرین نے ان کو 'امیر المومنین فی الحدیث' کے قابلِ فخر لقب سے نوازا۔ یہ اعتماد و افتخار والا لقب متعدد اکابرِ محدثین کے لیے بھی استعمال ہوا، لیکن امام ابن اسحاقؒ کے لیے اس کا استعمال ایک خاص معنی اور عظیم جہت رکھتا ہے، کیوں کہ ان پر بعض اہلِ علم نے نقد و جرح بھی کی ہے۔ فنونِ سیرت و حدیث میں ان کے اعتبار و ثقاہت کے لیے یہ حقیقت کافی ہے کہ اکابر محدثین بالخصوص صحاح ستہ کے عالی مقام مؤلفین نے ان سے بہت سی روایات لی ہیں۔[۱]

سیرت و حدیث کے اس مایہ ناز امامِ وقت کا رجحان ساز افتخار یہ بھی ہے کہ وہ اولین دستیاب کتابِ سیرت کے عظیم مولف ہیں۔ ان کے پیش رووں اور بزرگ معاصروں میں متعدد اہلِ فن نے اپنے اپنے زمانے میں کتبِ سیرت تالیف کی تھیں، لیکن وہ اتنی جامع، ہمہ گیر اور مفصل و مدلل نہ تھیں اور وہ وقت و زمانہ کے تخریب کن دھاروں کا شکار ہو کر نابود بھی ہوگئیں۔ امام ابن اسحاقؒ کی کتابِ سیرت کا کامل عنوان تھا: ''کتاب المبتدا والمبعث والمغازی''، جو عام طور پر سیرت ابن اسحاق کہلاتی ہے۔ اس کے تین حصوں میں بالترتیب تاریخِ آفرینش وانبیاء و آباء و اجداد نبوی، رسول خدا ﷺ کی مکی اور مدنی زندگی زیر بحث آئی ہے۔ سیرت و تاریخ کی اس سہ گانہ تقسیم نے ابن اسحاق کے معاصرین کے ساتھ تمام متاخرین کو بہت متاثر کیا ہے۔ وہ اپنے عہد سے آج تک سیرتِ نبوی کا سب سے بڑا ماخذ و مرجع بنی رہی ہے اور اس سے کسی صاحبِ علم کو ذرا بھی مفر

نہیں۔ سیرتِ ابن اسحاقؒ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء- ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) کا سیرت و تاریخِ اسلامی میں غالباً سب سے اہم اور سب سے بنیادی ماخذ ہے۔ نہ صرف سیرتِ نبوی میں، بلکہ خلافتِ راشدہ کی تاریخ وتہذیب میں وہ شاہ صاحب کا مرجع اول ہے۔[۲]

شاہ صاحبؒ نے امام ابن اسحاقؒ اور ان کی سیرت نبوی کو اپنی مختلف کتابوں میں اپنا اہم ترین ماخذ بنایا ہے۔ 'فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن' کے حواشی میں تاریخی واقعات، بالخصوص عہدِ نبوی کے واقعات ومغازی اور معاصرین کے احوال کے بیان کے لیے ان کی روایات لی ہیں۔ 'الفوز الکبیر' میں بعض مباحث میں ان کا ذکر کرکے ان پر نقد وجرح بھی کی ہے۔ وہ صرف سرسری حوالے کے ضمن میں ہی آتی ہے۔ مقدمہ 'شرح تراجم ابواب صحیح البخاری' میں شاہ صاحبؒ نے ایک اہم بحث میں ان کا ذکر کیا ہے اور اس کو 'قرۃ العینین فی تفصیل الشیخین' اور 'ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء' میں مزید دہرایا ہے اور ایک خاص فن/علمِ حدیث کا ان کو بانی بتایا ہے۔ ان دونوں بلکہ تو ام کتبِ تاریخِ خلافتِ راشدہ میں انھوں نے سیرتِ ابن اسحاق کو اپنا سب سے بڑا ماخذ ومرجع بنایا ہے۔ خلفاءِ راشدین کے مناقب و واقعات اسی سے اخذ کیے ہیں۔ سیرتِ ابن اسحاق کی ان تمام جہات پر بحث مختصر ہی کی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ مفصل تجزیہ ایک کتاب کا متقاضی ہے۔ یہ مختصر بحث چند عناوین کے تحت کی جاتی ہے، تاکہ سیرتِ ابن اسحاقؒ کے حضرت شاہؒ صاحب کے ایک اہم ماخذ ہونے کی تفہیم ہوسکے۔

فنِ سیرت علمِ حدیث کی ایک قسم

اہل علم اور ماہرین فنون نے اپنی بحث وتحلیل سے ثابت کیا ہے کہ علمِ سیرت ابتداء میں علمِ حدیث کا ہی ایک حصہ تھا۔ رفتہ رفتہ خلافتِ اموی میں متعدد تابعینِ کرام نے اختصاصِ سیرت پیدا کیا اور اس کو علم حدیث سے الگ کرکے ایک جداگانہ علم وفن بنادیا۔ ان میں بزرگ تر شیوخ کے علاوہ امام ابن اسحاقؒ ممتاز ترین تھے۔[۳] حضرت شاہ صاحب

نے اس بابِ خاص میں ایک نئی تحقیق پیش کی ہے جو علمِ حدیث اور علمِ سیرت کے باہمی ارتباط و تفاعل کو واضح کرتی ہے۔ اس کے مطابق اہلِ حدیث (یعنی محدثین) نے جو کچھ ابتدا میں تصنیف کیا تھا اس کو چار فنون میں مدون کیا گیا:

۱- فنِ السنۃ: یعنی فقہِ حدیث، جس کی اہم ترین تالیفات موطا امام مالک اور جامعِ سفیان ثوری تھیں۔

۲- فنِ تفسیر، جس کی نمائندہ کتاب ابن جریج کی تھی۔

۳- فنِ سیر، جس میں محمد بن اسحاق کی کتاب جیسی تالیفات تھیں۔

۴- فنِ زہد و رقاق، جس میں ابن مبارکؒ کی کتاب اہم ترین تھی۔

ایک دوسری کتاب میں حضرت شاہ صاحبؒ نے علمِ حدیث کو پانچ فنون میں مدون کرنے کی بات کہی ہے۔ اس اعتبار سے پانچویں قسم 'معرفۃ الصحابہ' ہے جس کی ایک نمائندہ کتاب 'الاستیعاب' ہے۔ شاہ صاحبؒ کی فکر کا یہ ارتقاء بعد کی تالیف میں ملتا ہے۔ اصلاً وہ چار فنون کی تدوین کی بات کرتے ہیں، کیوں کہ ان کا اگلا نکتۂ تحقیق یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی الجامع الصحیح میں ان چاروں فنونِ حدیث کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔[۴]

روایاتِ وابوابِ ابن اسحاقؒ کے لیے شواہدِ بخاریؒ

شاہ ولی اللہؒ نے اس سے زیادہ اہم اور فنی نقطۂ نظر سے معنی خیز بات یہ کہی ہے کہ امام بخاریؒ نے بعض ابوابِ صحیح میں اصلاً امام ابن اسحاق کے بعض ابواب اور ان میں مذکور روایات و اخبار کے لیے 'شواہد' (تائیدی احادیث) پیش کی ہیں۔[۵] شارحین صحیح بخاری نے امام بخاریؒ کے اپنی کتاب المناقب میں بابِ قحطان وغیرہ کے لانے اور ان میں بعض احادیث روایت کرنے پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس کی توجیہ نہیں کر سکے کہ امام بخاریؒ نے ان کا ذکر کیا ہی کیوں؟ حضرت شاہؒ نے اس کی توجیہ و تاویل یہ کی ہے کہ امام محمد بن اسحاقؒ نے اپنی سیرت میں ایسے قِصَص (قصوں/ واقعات) پر بہت طویل کلام کیا ہے۔ ان کے ان اخبار و قصص پر محدثینِ کرام کو بالعموم شک و شبہ رہا ہے اور وہ ان کو

حدیثی استناد سے محروم سمجھتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے دراصل ان تمام قصوں میں سے ہر ایک کے لیے صحیح احادیث سے شواہد فراہم کر کے ان کو مستند و معتبر بنایا ہے، اسی لیے امام بخاری نے قصۃ الیمن، ذکرِ قحطان، حلف الفضول، تسلط خزاعۃ، قصۃ زمزم، نسبِ نبوی، زمانہ و وقت ولادتِ نبوی، ذکر حبشہ و بنی ارفدۃ کے ابواب وقصص میں اپنے شواہد بیان کیے ہیں۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ سب اخبارِ ابن اسحاقؒ معتبر ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اُن واقعات وقصصِ ابن اسحاقؒ کے لیے، جن میں امام بخاریؒ کو شواہد نہیں مل سکے، خود شواہدِ حدیث بیان کیے ہیں۔[۶]

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس شاہدِ بخاری کی جو تفصیل دی ہے اس کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے، تاکہ اصل اور شاہد واضح ہوجائے:

- محمد بن اسحاقؒ نے حرسے قصۃ الیمن کا ذکر کیا ہے اور امام بخاریؒ نے اس کا شاہد پیش کیا ہے اور حدیث صحیح میں قحطان کا ذکر لائے ہیں۔ سیرت ابن اسحاقؒ (۳/۱) میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کے نسب کے بیان: ''سیاقۃ النسب من ولد اسمٰعیل علیہ السلام'' میں جرہم کو ابن قحطان بتایا ہے اور قحطان کو پورے یمن کا باپ اور اسی کی طرف نسب کے راجع ہونے کا ذکر کیا ہے: ''وقحطان ابوالیمن کلہا، والیہ تجمع نسبہا''۔ آگے چل کر ابن ہشامؒ نے یہ صراحت کی ہے کہ تمام عرب حضرت اسمٰعیل و قحطان کی اولاد ہیں۔ احادیث بخاری: ۳۵۰۰، ۷۱۳۹ (اول الذکر کے طرف) اور حدیث: ۳۵۱۷ مع طرف: ۷۱۱۷ میں قحطان کا ذکر ہے اور وہ دونوں احادیث حضرات محمد بن جبیر بن مطعم بن عدی نوفلی اور ابو ہریرہ وغیرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ''نسبۃ الیمن الی اسماعیل'' میں قحطان کے اولادِ اسمٰعیل ہونے سے مفصل بحث کی ہے۔[۷]

حضرت شاہؒ نے دوسری مثال یا بحث حلف الفضول کی دی ہے کہ امام ابن اسحاقؒ نے اس کا ذکر عربوں کے معاہدوں (معاداۃ) کے لحاظ سے کیا ہے۔ اور امام بخاری نے اپنے قول ''باب ما یُنہٰی من دعوی الجاہلیۃ'' سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔[۸]

- امام ابن اسحاقؒ نے مکہ پر خزاعہ کے تسلط کا ذکر کیا ہے اور اس کے لیے امام

بخاریؒ نے شاہد پیش کیا ہے، جو عمرو بن لحی اور اس کی سوائب سازی (تسییبہ السوائب) کا ذکر کرتا ہے۔۹

- امام ابن اسحاقؒ نے عبدالمطلب کے زمزم کھودنے کا ذکر کیا ہے اور اس کے لیے امام بخاریؒ نے جو شاہد پیش کیا ہے اس میں حضرت ابوذر غفاریؓ کے قبول اسلام اور ان کے زمزم سے پینے کا بیان ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ زمزم اولین بعثتِ نبوی میں موجود تھا۔۱۰

- بعثتِ نبوی سے قبل عربوں کی جہالت کا ذکر اس قصہ کے ساتھ کیا ہے کہ اس نے جاہلیت میں اپنی دختر کو قتل کر دیا تھا اور اس کا شاہد بخاری میں قول اللہ تعالیٰ: "قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْا اَوْلَادَهُمْ" سے پیش کیا۔۱۱

- ابن اسحاقؒ نے نسبِ نبوی کو سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام تک پہنچایا اور امام بخاریؒ نے امام مالکؒ سے روایت کر کے اسماعیلؑ کے اوپر اسے پہنچانے میں ان کی مدد کی۔ اسی طرح ابن اسحاق نے میلادِ نبوی میں قصۃ الفیل اور یمن پر اس کے لشکر کا غلبہ بیان کیا، مگر بخاریؒ کو اس کا شاہد نہیں ملا، لیکن وہ قول الٰہی: ''أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحٰبِ الْفِيْلِ '' کو لائے ہیں اور حدیث میں حبشہ کا ذکر ان کے لیے خطاب بنی ارفدہ کے ساتھ کیا ہے۔۱۲

مناقبِ صدیق اکبر میں روایاتِ ابن اسحاق

حضرات شیخین - حضرات ابوبکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما - کے مناقب کے باب میں بالخصوص اور حضرات ختنین - حضرات عثمان ذوالنورین و علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما - کے مناقب و فضائل اور دوسرے صحابہ کرام کے احوال میں بالعموم حضرت شاہ صاحبؒ امام ابن اسحاقؒ کی روایات سب سے زیادہ بیان کرتے ہیں، اگرچہ ان کے مآخذ دوسرے سوانح نگار، ماہرینِ انساب اور تاریخ نویس بھی ہیں، لیکن وہ ثانوی ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے مناقب ہوں یا دوسرے خلفاءِ کرام کے، یا ان کے وہ واقعات و احوال

ہوں، جن کا تعلق عہد نبوی سے ہے، ان میں حضرت شاہؒ کے سب سے بڑے اور سب سے معتبر و معتمد ماخذ امام ابن اسحاقؒ ہی ہیں۔ مناقبِ صدیقی کے ضمن میں روایاتِ ابن اسحاق کا ایک تجزیہ پیش ہے:

- حضرت صدیق اکبرؓ کی مقبولیت اور عالی نسبی اور ان کی مہارتِ علمِ نسب۔۱۳

- حضرت ابوبکرؓ کی محبوبیت و مقبولیت اور اثر و رسوخ کی وجہ سے ان کے ہم مجلس صحابہ ستہ کا ذکر صرف ابن اسحاق سے لیا ہے۔۱۴

- کمزوروں اور غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کا واقعہ ابن اسحاقؒ سے نقل کیا ہے اور اس کو زیادہ واضح و مفصل بتایا ہے اور حضرت علیؓ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کی گود میں تربیت پائی تھی۔۱۵

- صحیفۂ مقاطعہ اور یہ بات کہ مقاطعہ کے دوران حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپ ﷺ کا ساتھ دیا تھا۔ اس کا ذکر سیرتِ ابن اسحاق سے کیا ہے۔۱۶

- غزوۂ احد میں رسولِ اکرم ﷺ کی حفاظت و حمایت میں حضرت صدیق دوسرے صحابہ کے ساتھ تھے۔۱۷

- فتحِ مکہ سے قبل صلح حدیبیہ کی بحالی کے لیے سفارتِ ابوسفیان کا واقعہ۔۱۸

- فتحِ مکہ کے موقعہ پر نبوی داخلہ اور خدمتِ نبوی میں حضرت ابوبکر کے والد ماجد حضرت ابوقحافہؓ کی حاضری کا واقعہ۔۱۹

- غزوۂ طائف کے دوران ثقیف کے محاصرہ، اس کے بارے میں رویائے نبوی اور اس کی تعبیر اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے سے اتفاقِ نبوی، غنائمِ حنین میں سے اپنے حصہ پر عباس بن مرداس سُلمیؓ کی ناراضی اور ان کے اشعار۔۲۰

- سنہ ۹ ھ میں حج کی امارتِ ابی بکر صدیقؓ اور سورۂ براءت کے اعلان کے لیے حضرت علیؓ کی تقرری کا مفصل واقعہ۔۲۱

- مرض الموت میں رسولِ اکرم ﷺ کے واقعہ تخییر پر حضرت صدیق کی آہ و بکا،

مسجد میں روشن دانوں (خوخہ) کے بند کرنے سے صرف خوخۂ ابی بکر کا استثناء، رسول اکرم ﷺ کی حدیث: "**لو کنت متخذا من العباد خلیلا لاتخذت ابابکر خلیلا**"۔۲۲

ان کے علاوہ بعض دوسری روایاتِ ابن اسحاق حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مآثر اور مناقب کے بارے میں مذکور ہیں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ دوسرے ابوابِ مناقب میں حضرت امام کے حوالے موجود ہوں اور ان پر نظر نہ پڑی ہو، بالخصوص حضرت عمر فاروقؓ کے مناقب میں امامِ ابن اسحاقؒ کی روایات وغیرہ کے ضمن میں شاہ ولی اللہؒ نے یہ صراحت کی ہے کہ شیخینؓ کے مشترکہ فضائل تھے اور ان کے مآخذ بھی مشترکہ ہیں۔ لہٰذا روایاتِ سیرت کی تعداد بڑھ سکتی ہے۔ قرۃ العینین میں عہد نبوی کے بعد کے واقعات و آثار کا ذکر صرف چند سطروں میں ہے اور ازالہ میں ان ابواب کا ان کی روایات کے ساتھ اضافہ فرمایا ہے۔۲۳

مناقبِ فاروقیؓ میں ابن اسحاقؒ کے حوالے

عہدِ نبوی سے متعلق واقعات، احوال او رمناقب و کمالاتِ فاروقی کے ایک بڑے ماخذ امام ابن اسحاقؒ ہی ہیں۔ بلاشبہ ان کے علاوہ دوسرے بہت سے مآخذ بھی ہیں، جن کی غالب اکثریت محدثینِ کرام اور ان کی کتابوں کی مفصل و مستند روایات ہیں۔ سیر و سوانح نگاروں میں شاہ صاحبؒ نے امام ابن اسحاقؒ کے علاوہ بعض دوسرے اہلِ علم سے بھی روایات لی ہیں، جیسے ابن عبدالبر قرطبی کی الاستیعاب وغیرہ، لیکن ان کی روایات کے مآخذ میں محدثین کے علاوہ غالب حصہ امام ابن اسحاقؒ کا ہی ہے۔ ان مناقب کے سلسلے میں روایاتِ ابن اسحاق کا ایک جائزہ درجِ ذیل ہے:

- اسلامِ حضرت عمر فاروقؓ کی مشہور ترین روایت ابن اسحاقؒ سے بیان کی ہے اور کافی تفصیل کے ساتھ۔ دوسری روایتِ قبولِ اسلام بھی ابن اسحاق سے لی ہے۔۲۴

اپنے اسلام قبول کرنے کے واقعہ کی اشاعت کے لیے حضرت عمرؓ نے جمیل بن

معمر جہمی کو استعمال کیا تھا۔ یہ خاصا طویل واقعہ ہے۔ بخاری میں اس کا شاہد بھی موجود ہے۔بعض اور واقعات بھی ہیں۔۲۵

- اسلامِ حضرت عمرؓ کی وجہ سے مسلمانوں کو تقویت، خانۂ کعبہ کے صحن میں نماز، اکابر قریش سے حق کی وصولی وغیرہ، تبصرۂ ابن مسعودؓ، عاص بن وائل سہمی کے جوار دینے کا واقعہ ابن اسحاقؒ سے مروی ہے قرۃ میں اور بخاری سے بھی۔ نیز ابوجہل مخزومی کو اپنے اسلام کی خبر دینے کا ذکر بھی ابن اسحاقؒ سے ہے۔۲۶

- غزوۂ بدر کے فضائل اور اسیرانِ بدر کے بارے میں حضرت عمرؓ کی رائے وغیرہ کے واقعات ابن اسحاقؒ سے مع واقعہ عمیر بن وھبؓ نیز حضرت عباسؓ کے قتل کا ارادہ کرنے والے صحابی ابوحذیفہؓ کے خلاف اقدام فاروقی۔۲۷

- غزوۂ احد میں فضائلِ فاروقی کے ضمن میں اعلانِ ابوسفیان اموی کے جواب میں نعرۂ فاروقی وغیرہ۔۲۸

- واقعۂ افک/ غزوۂ مریسیع میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے قتل کی تجویزِ فاروقی اور فرمانِ نبوی (بروایت مسلم بھی) قصہ جہجاہ غفاری اجیرِ عمرؓ۔۲۹

- صلحِ حدیبیہ میں شرائطِ صلح پر حضرت عمرؓ کی بحث وتکرار وغیرہ کا مفصل واقعہ۔۳۰

- غزوۂ خیبر میں شرکتِ فاروقی اور بعض واقعاتِ غزوہ، مثلاً حضرت عامر بن اکوعؓ کی رجز خوانی کی روایات ابن اسحاق سے۔۳۱

- فتحِ مکہ میں حضرت ابوسفیان امویؓ سے مباحثۂ فاروقی کا مفصل ذکر۔ دوبارہ حوالہ دررسالۂ تصوف فاروقی: ''**اشد هم فی امر الله عمرؓ**''۔۳۲

- غزوۂ طائف کے بعض واقعات و روایات کے لیے سیرتِ ابن اسحاق کا حوالہ، نذرِ اعتکاف کی روایت بھی۔ ذوالخویصرہ کا واقعہ در تقسیمِ غنائم اور مطالبۂ عدل، حدیث بابت خوارج۔۳۳

- عہد نبوی سے متعلق واقعات ومناقب اسی پر ختم ہوتے ہیں، بالخصوص قرۃ العینین میں۔ بعد کے واقعاتِ خلافت شیخین کا بیان مختصر ہے۔۳۴

مناقبِ حضرت عثمان ذوالنورینؓ

شاہ ولی اللہؒ نے خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفانؓ کے مناقبِ جمیلہ میں محدثین کرام اور ان کی کتب کے بعد محبّ طبری کی الریاض النضرۃ سے زیادہ روایات لی ہیں۔ بعض اور بھی اہم ترین کتبِ سیر وسوانح جیسے روضۃ الاحباب وغیرہ ہیں، لیکن ان میں امام ابن اسحاقؒ شامل نہیں ہیں۔ ۳۵ روایاتِ ابن اسحاق کی عدم موجودگی حیرت انگیز ہے۔

مناقبِ حضرت علی مرتضیٰؓ میں روایاتِ ابن اسحاقؒ

اس کے بالمقابل حضرت علی بن ابی طالب ہاشمیؓ کے مناقب و فضائل میں حضرت شاہ صاحبؒ نے امام ابن اسحاقؒ سے بہت روایات لی ہیں۔ ان کا ایک جائزہ درجِ ذیل ہے:

- حضرت علیؓ کی کفالتِ نبوی اور حضرت جعفرؓ کی کفالتِ حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ اور چچا ابوطالب کی امداد پر حدیث واقعہ۔ ۳۶
- حضرت علیؓ کے ایمان لانے اور رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ نماز میں ان کی شرکت اور ابوطالب کے استفسار کی روایت۔ ۳۷
- ہجرتِ نبوی کے واقعات میں حضرت علیؓ کی شرکت کے واقعات، جیسے بسترِ نبوی پر سونا، لوگوں کی امانتیں واپس کرنا اور ہجرت کرنا۔ ۳۸
- غزوۂ بدر کے واقعات میں حضرت علیؓ کے کارنامے: دشمنوں کی خبر لانا، مبارزت، شجاعت اور دوسرے واقعات میں شرکت۔ ۳۹
- غزوۂ احد کے واقعات: شہادتِ مصعبؓ کے بعد علَم حضرت علیؓ کو عطا کرنا، قتال و جہاد میں ان کا حصہ، ذوالفقار کا عطیہ وغیرہ۔ ۴۰
- غزوۂ خندق میں شہامت وشجاعت، قتلِ عمرو بن عبد ود وغیرہ، غزوۂ بنوقریظہ میں قلعہ فتح کرنے کا کارنامہ۔ ۴۱

صلح نامۂ حدیبیہ کے کاتب حضرت علیؓ، ان کے ساتھ 'منتظر الخلافۃ' کا معاملۂ

نبوی۔۴۲؎ (منتظر الخلافۃ کا نظریۂ شاہ بہت اہم ہے)

- غزوۂ خیبر میں پرچم نبوی کا عطیہ اور حضرت علیؓ کی فتوحات۔ بعض روایات پر نقد بھی ہے۔۴۳؎

- فتحِ مکہ کے موقعہ پر اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت سعد بن عبادہؓ سے پرچم حضرت علیؓ کو دلوایا، لیکن سقایہ کے ساتھ حجابہ کی تجویز علی نہیں مانی۔۴۴؎

- سریۂ بنوجذیمہ کی امارت پر حضرت علیؓ کا تقرر اور اس سریہ کے واقعات وغیرہ۔۴۵؎

- غزوۂ حنین میں حضرت علیؓ کی ثابت قدمی اور ہوازن پر حملوں کا واقعہ۔۴۶؎

- غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت علیؓ کی اہلِ بیت کے کاموں پر تقرری، غزوہ میں شریک نہ ہونے پر بعض لوگوں کی جانب سے اعتراضات پر تسلی نبوی۔۴۷؎

- حجِ ابی بکرؓ میں اعلانِ سورۂ براءت کی ذمہ داری کا واقعہ۔۴۸؎

- یمن سے حضرت خالد بن ولیدؓ کے بعد حضرت علیؓ کا وصولیٔ صدقات کے منصب پر تقرر، لوگوں کو ان سے شکایت اور اس کا ازالہ۔۴۹؎

- وفاتِ نبوی کے بعد رسولِ اکرم ﷺ کے غسل، تجہیز و تکفین اور تدفین میں حضرت علیؓ کی خدمات، جیسے قبرِ نبوی میں اترنا وغیرہ۔۵۰؎

- حضرت علیؓ کے اخلاق و عادات، خصائل و مقامات میں روایاتِ ابن اسحاق۔ حاکم از ابن اسحاق۔ حضرت عباسؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کے وارثِ نبوی بننے کی وجوہ سے بحث میں ابن اسحاق کا حوالہ۔۵۱؎

حضرات خلفائے راشدین کے عہدِ نبوی سے متعلق واقعات، مناقب، فضائل اور خدمات کا ایک اہم ماخذ امام ابن اسحاقؒ ہیں، جن کی سیرت سے شاہ ولی اللہؒ نے خوب استفادہ کیا ہے۔ ان کو ایک طرح سے ان کا اہم ترین ماخذ کہا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ دوسرے مآخذِ سیرت اور مصادرِ حدیث بھی اس باب میں ان کے اہم ترین مراجع ہیں اور ان کی روایات کی کثرت بھی ہے، لیکن اس سلسلہ میں ایک اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ متعدد ائمۂ سیرت و حدیث نے امام ابن اسحاقؒ سے ہی اپنا مواد لیا ہے۔ اس قسم کے مواد کو دو قسموں

میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک وہ روایات ہیں جن میں ماخذِ اصلی -ابن اسحاقؒ- کا واضح ذکر سند کے اواخر یا اواسط میں ملتا ہے، جیسے امام حاکمؒ کی ایک روایت کے بارے میں اوپر ذکر کیا گیا۔ دوسری وہ روایات واحادیث ہیں جن میں محدثین واہلِ سیر نے یا تو امام ابن اسحاقؒ سے اخذ وقبول کا واضح ذکر نہیں کیا اور اگر کیا بھی تھا تو حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کی تصریح وتحقیق نہیں پیش کی، بلکہ امام حاکمؒ، محبّ طبریؒ، ابن عبدالبرؒ (ابوعمر وغیرہ) کا ذکر کردیا۔ تحقیق اور موازنہ سے متاخر اہلِ سیر اور اہلِ حدیث دونوں طبقات کی بہت سی روایات و احادیث کا ماخذ ابن اسحاق کی سیرت ہوسکتی ہے۔ بہرحال اولین تین خلفاءِ راشدین کے بارے میں ازالہ اور قرۃ دونوں کی مشترکہ روایاتِ ابن اسحاق ان دونوں کتبِ شاہ کو تو اُم تصانیف قرار دیتی ہیں۔ البتہ حضرت علیؓ کے بارے میں مناقب واحوال و واقعات میں کسی ماخذ کا ذکر قرۃ العینین میں نہیں ہے اور عہد نبوی کے واقعات کو صرف ایک صفحہ میں بیان کردیا ہے۔۵۲

حواشی فتح الرحمٰن میں روایاتِ ابن اسحاقؒ

قرآنیات میں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنے فارسی ترجمۂ قرآن -فتح الرحمٰن- کے حواشی میں امام ابن اسحاقؒ کا ایک صریح حوالہ دیا ہے۔ وہ سورۂ انعام:۱۱۴ میں ہے: ’’أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِيْ حَكَماً وَهُوَ الَّذِيْ أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلاً وَالَّذِيْنَ آتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلاَ تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ‘‘ (اب سوا اللہ کے کسی اور کو منصف کروں؟ اور اسی نے تم کو کتاب بھیجی واضح، اور جن کو ہم نے کتاب دی وہ سمجھتے ہیں کہ یہ نازل ہوئی ہے تیرے رب کے پاس سے، تحقیق سومت ہوشک لانے والا)۔ [ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی، موضح القرآن میں حاشیہ نہیں۔] شاہ صاحبؒ نے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ یہودی جانتے ہیں کہ وحی کا نزول ہوتا ہے اور آدمی کو ’’خدائے تعالیٰ پیغامبر بناتا ہے اور قرآن مجید میں حضرت پیامبر ﷺ کی سچائی کے دلائل موجود ہیں۔ مترجم کہتا ہے کہ مکی

سورتوں میں یہ مذکور ہے کہ یہود قرآن کی تصدیق کرتے ہیں اور مدنی سورتوں میں یہ بیان آتا ہے کہ یہود اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ان دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جب آں حضرت ﷺ مکہ میں تھے تو آپؐ نے یہود کو دعوت نہ دی تھی، لہٰذا وہ قرآن کی سچائی کے پورے معترف تھے کہ اس کا حکم صرف عربوں پر لازم آتا تھا۔ اور اس کا کسی شخص نے انکار نہ کیا تھا۔ جب آں حضرت ﷺ نے ہجرت کی اور ان یہود کو بھی دعوت دی تو ان میں عناد پیدا ہوگیا اور وہ انکاری بن گئے۔ سیرتِ ابن اسحاقؒ میں اس مضمون کے چند قصے مذکور ہیں۔واللہ اعلم''۔۵۳

حواشی فتح الرحمٰن میں بہت سی آیاتِ کریمہ کے حوالے سے تاریخی واقعات اور معاصر احوال کا ذکر کیا گیا ہے۔ان میں سے بیش تر میں سیرت ابن اسحاقؒ میں مذکور واقعات و روایات وغیرہ کا ذکر حضرت شاہؒ نے کیا ہے، لیکن اپنے معمول و دستور کے مطابق ان کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ ایک تقابلی مطالعہ سے اس کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ بہرحال الفوزالکبیر سے ایک دلچسپ اقتباس اس ضمن میں نقل کرنا مناسب ہوگا۔مفسر کے لیے لازمی شرائط کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:''...ایک غزوات وغیرہ کے قصے جن کی خصوصیات کی جانب مختلف آیتوں میں ایسی تعریفات ہیں کہ تاوقتیکہ ان واقعات کا علم نہ ہو اس وقت تک آیات کی حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہوسکتی...''۔۵۴

اسی کتاب میں ایک جگہ حضرت شاہ صاحبؒ نے امام ابن اسحاقؒ کے ساتھ بعض دوسرے مفسرین پر نقد کیا ہے کہ''محمد بن اسحاق، واقدی، کلبی نے ہر آیت میں ایک قصہ بیان کر کے افراط کیا ہے اور وہ محدثین کے نزدیک صحیح نہیں''۔۵۵

اس نقد میں حضرت شاہؒ نے ابن اسحاقؒ کی کتاب کا نام نہیں لیا، مگر بظاہر اس سے مراد ان کی سیرتِ نبویہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ امام ابن اسحاقؒ نے کم ازکم ہر آیت میں، جیسا کہ حضرت شاہؒ کا عمومِ دعویٰ ہے، ایک قصہ نہیں بیان کیا ہے، صرف متعلقہ بابِ سیرت سے متعلق آیات کریمہ کا نزول اوران کے اسباب سے بحث کی ہے اور وہ بسا اوقات بہت عمدہ ومعتبر ہے اوراس کا محدثین بھی اعتبار کرتے ہیں۔۵۶

مختصر تجزیہ

شاہ ولی اللہؒ نے اپنی متعدد نگارشات میں امام ابن اسحاقؒ کی کتابِ سیرت کا مختلف ناموں سے ذکر کیا ہے۔ ان کا اسم گرامی کبھی محمد بن اسحاقؒ لکھا ہے اور کبھی صرف ابن اسحاقؒ۔ اسی طرح ان کی کتاب کو کبھی صرف سیرت کہا ہے، کبھی کتابِ سیرت اور کبھی سیرتِ ابن اسحاقؒ۔ سب سے دلچسپ عنوان، جو انھوں نے دیا ہے وہ 'السیرۃ الکبریٰ' ہے، جو غالباً کسی اور ماخذ و مصدر میں کسی دوسرے ماہرِ فن سے منقول نہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے زمانے میں امام ابن اسحاقؒ کی سیرت رسول اللہ ﷺ یا السیرۃ النبویۃ کا اصل نسخہ دستیاب و موجود تھا بھی یا نہیں؟ یا دوسرے اہلِ علم کی مانند صرف امام ابن ہشامؒ کی تہذیب و تلخیصِ سیرت ابن اسحاقؒ سے انھوں نے مواد لیا ہے؟ یہ تحقیق طلب ہے ☆۔ البتہ انھیں قطعی طور سے یہ علم تھا کہ امام ابن ہشامؒ نے اپنی تہذیبِ سیرۃ میں اضافات بھی کیے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کا ذکر انھوں نے واضح طور سے 'الزیادات/ زیادۃ علی السیرۃ' کے فقرے سے کیا ہے۔

سیرتِ ابن اسحاقؒ کو ماخذ بنانے کے ضمن میں حضرت شاہ صاحبؒ کے دو رویے نظر آتے ہیں۔ ایک مثبت تھا، دوسرا منفی۔ منفی رویہ یہ ہے کہ انھوں نے کتابِ سیرت کے اصل موضوع یا امامِ سیرت کے محوری مضمون -سیرتِ نبوی- کے بیان میں اس کا ایک حوالہ نہیں دیا۔ اپنی شاہ کار کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ''باب سیرالنبی ﷺ'' میں سارا مواد انھوں نے کتبِ حدیث سے لیا ہے، لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ مثبت روش یہ ہے کہ حضرات خلفاءِ راشدین کی سوانح و واقعات اور فضائل و مناقب میں انھوں نے امام ابن اسحاقؒ کا بہت حوالہ دیا ہے۔ حالاں کہ ان تمام کا تعلق عہدِ نبوی ہی سے نہیں، خالص سیرتِ نبوی سے ہے اور وہ ایک طرح سے سیرتِ نبوی کے ضمنی مباحث یا برکات ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی عظیم تالیف فتح الرحمٰن کے حواشی میں ابن اسحاقؒ کا حوالہ کم از کم ایک

☆ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ سیرت ابن اسحاق کا اصل نسخہ حضرت شاہ ولی اللہ کی دست رس میں نہیں تھا، انھوں نے سارا مواد سیرۃ ابن ہشام کے واسطے سے لیا ہے۔ (مدیر)

جگہ صراحت سے دیا ہے۔ دوسرے تاریخی مباحث و واقعات و احوال کے بارے میں یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ کتابِ ابن اسحاقؒ سے ہی ماخوذ ہیں۔ حدیث بالخصوص تدوین حدیث کے باب میں ان کا حوالہ بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ فنِ سیرت کو چار یا پانچ علومِ حدیث میں شمار کرنا ان کا ایک فنّی کارنامہ ہے اور اس کی تدوین کے باب میں امام ابنِ اسحاقؒ کی کتاب کا موسیٰ بن عقبہؒ کی کتاب کے ساتھ ذکر کرنا دوسرا کارنامہ ہے۔ بالخصوص اس پس منظر میں کہ فنِ سیرت کو مدت ہوئی بارگاہِ حدیث سے نکال کر معرضِ نقد و رد بنا دیا گیا تھا، اور اس بنا پر بھی کہ امام ابن اسحاقؒ کو اسی فن میں ہدفِ ملامت بنا کر ان کو پایۂ اعتبار اور مسندِ ثقاہت سے گرا دیا گیا تھا۔ حضرت شاہؒ نے اپنے اس مختصر تجزیہ میں امام ابن اسحاقؒ کی ثقاہت، معتبریت، اور امامتِ حدیث کا ایک شاہد پیش کیا ہے۔

فنِ سیرت میں امام ابن اسحاقؒ کی ثقاہت و امامت کا غالباً سب سے بڑا شاہدِ عدل یہ ہے کہ حضرت شاہؒ نے سیرتِ نبوی کے بعض مباحث، جن کو متعلقاتِ سیرت اور تاریخی پس منظر بھی کہا گیا ہے، ان سے متعلق امامِ موصوف کی روایات و اخبار کی صحت و اعتبار ثابت کرنے کے لیے امام بخاریؒ کی مستند جامع صحیح میں صحیح احادیث کے شواہد پیش کیے ہیں۔ انھوں نے تراجم ابوابِ بخاری کی شرح پر اپنے شاندار رسالے میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے اور ایک انکشاف کیا ہے۔ صحیح بخاری کے شارحینِ کرام، بالخصوص تراجمِ ابواب کی تحقیق کرنے والے علماء کو اس پر حیرت تھی کہ امام بخاریؒ نے قدیم جاہلی دور کے مباحث سے متعلق ابواب کیوں قائم کیے اور ان میں ایسی احادیث کیوں لائے جن کا تعلق براہِ راست رسول اکرم ﷺ کی سیرت و حدیث سے نہیں ہے۔ حضرت شاہؒ نے یہ تشریح و تحقیق کرکے سب کو چونکا دیا کہ امام بخاریؒ نے روایات و اخبارِ ابن اسحاقؒ کی تصدیق و تعدیل کے لیے ان احادیث کو بطور شواہد پیش کیا ہے۔ بہر حال اہلِ علم اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ امام بخاریؒ نے سیرت کے واقعات بالخصوص مغازی میں دونوں امامانِ سیرت - ابن اسحاقؒ و موسیٰ بن عقبہؒ- کی روایات و احادیث سے ہی استدلال و استشہاد کیا ہے۔ اس سے شاہ ولی اللہؒ کا یہ دعویٰ بھی ثابت ہوتا ہے کہ علم حدیث

کی چہارگانہ/ پنجگانہ تدوین کے حوالے سے کتاب ابن اسحاقؒ و کتاب ابن عقبہؒ کا جو حوالہ یا نظیر دی گئی ہے وہ امام بخاری کے نزدیک بھی صحیح ہے۔ غالباً ایک تحقیقی تقابلی مطالعہ یہ ثابت کرسکتا ہے کہ سیرت ابن اسحاقؒ کی بہت سی روایاتِ سیرت اور ان سے زیادہ احادیثِ شریعت امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں قبول کی ہیں، یا ان کے شواہد پیش کیے ہیں، جس طرح شاہ ولی اللہؒ کی یہ تحقیق ثابت کرچکی ہے کہ موطا امام مالک کی منقطع، موقوف اور مرسل احادیث کو مرفوع بنانے اور ان کی بلاغات کی رفعت واستناد ثابت کرنے کے لیے متعدد دوسرے امامانِ حدیث کی طرح امام بخاریؒ نے اپنی جامع صحیح تالیف کی تھی۔ موطا کی تمام روایات واحادیث صحیح بخاری میں موجود و مدغم ہیں اور ان کے اضافات میں بہت سے 'شواہد' ہیں، جو تائید وتصدیق کے لیے لایے گئے ہیں۔ صحیح بخاری کے مقام ومرتبہ اور اس کے مولف کی جلالت وامامت سے کسی کو انکار نہیں اور نہ ان تصدیقات وشواہد سے ان پر حرف آتا ہے کہ بہرحال موطا امام مالک صحیح بخاری وغیرہ کا ماخذِ اصلی ہے اور صحیح بخاری نے امام ابن اسحاقؒ کی سیرت کے اخبار و روایات واحادیث کے شواہد پیش کرکے اولین دستیاب ماخذِ سیرت اور اس کے عالی مقام مؤلف کا درجہ ثقاہت اور پایۂ اعتبار ثابت کردیا ہے۔

حواشی ومراجع

۱ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، محاکمہ سیرت ابن اسحاق، نقوش، رسول نمبر لاہور جنوری ۱۹۸۵ء، جلد: ۱۱، ۳۷۴-۳۷۵ و مابعد؛ راقم سطور کا مقالہ سیرت ابن اسحاق/ ابن ہشام، در کتاب 'مصادر سیرت نبوی'، انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی، ۲۰۱۰ء؛ شبلی/ سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی، اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء، ۱/۲۳ و مابعد کا بیان ہے ...'' لیکن محدثین کا عام فیصلہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں استناد کے قابل ہیں۔ امام بخاری نے صحیح بخاری میں ان سے کوئی روایت نہیں لی، البتہ جزء القرأۃ میں ان سے روایت کی ہے، تاریخ میں تو اکثر واقعات ان سے لیتے ہیں ...''۔

۲ حوالہ بالا؛ تنقیدی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو مقالۂ خاکسار ''سیرت ابن اسحاق/ ابن

ہشام کا تنقیدی مطالعہ'' برائے سیرت سمینار اعظم گڑھ، اکتوبر۲۰۱۰ء

۳؎ شبلی، محمد حمید اللہ، اور خاکسار کے مقالات مذکورہ بالا کے علاوہ مقالہ سیرت اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور اور دیگر فنی کتب ملاحظہ ہوں۔

۴؎ شاہ ولی اللہ، رسالہ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری، مطبعہ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن ۱۹۸۲ء، ۱-۴؛ قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۱۰/ ۱۸۹۳؛ میں اور بعد کی کتاب ازالۃ الخفاء میں حضرت شاہؒ کی فکر اول الذکر سے ہی آئی ہے؛ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، اردو ترجمہ اشتیاق احمد دیوبندی، حافظی بک ڈپو دیوبند، غیر مورخہ، فصل ششم، ۱/ ۳۶۹: حضرت شاہ نے پانچوں فنون میں ایک سے زیادہ کتب کی مثالیں دی ہیں۔ فنِ سیرت میں کتاب محمد بن اسحاقؒ کے ساتھ کتاب موسیٰ بن عقبہ کا بھی ذکر ہے۔ اور اس میں شمائل کے ابواب کو بھی داخل بتایا ہے۔ کتاب موسیٰ بن عقبہؒ اب مفقود ہے اور اس کی روایات دوسری کتبِ حدیث و سیرت و تاریخ میں ملتی ہیں۔ کتاب/ ابواب شمائل پر مشتمل الگ تالیفات ہیں اور ان میں امام ترمذی (م۲۷۹/۸۹۲) کی 'شمائل النبی ﷺ' اہم ترین ہے۔ حضرت شاہؒ نے پانچویں فن کو امام بخاری کی جامع صحیح میں سمو دینے کی بات نہیں کہی ہے، البتہ کتاب المناقب اور کتاب الفضائل میں اس کا وجود ہے۔

۵؎ محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی، معجم اصطلاحات حدیث، اردو ترجمہ سہیل حسن، دار الکتب السلفیہ دہلی ۲۰۰۴ء، ۲۰۵-۲۰۶، بحوالہ تیسیر ۱۲۸، معجم ۲۰۰، اصول الحدیث ۲۵۴: شاہد/ شواہد کی تعریف اور اس کے مقاصد سے بحث کی ہے اور متابع سے اس کا فرق بھی بتایا ہے۔

۶؎ شاہ ولی اللہ، شرح ابواب تراجم صحیح البخاری، ۱۲۹-۱۳۰، ابن حجر، فتح الباری، مکتبہ دار السلام ریاض وغیرہ، ۱۹۹۷ء، ۶/ ۶۵۲-۶۸۹ و مابعد۔ حافظ ابن حجرؒ نے عدنان کے نسبِ اسمٰعیلی وغیرہ پر امام ابن اسحاقؒ کی روایت کو اولیٰ کہا ہے: ۶/ ۶۵۸ وغیرہ۔ حافظ موصوفؒ نے متعدد ابواب میں امام ابن اسحاق کی روایات اور مباحثِ مطولہ کا ذکر کیا ہے جیسے ۶/ ۶۷۰: 'السیرۃ الکبریٰ' میں عمرو بن لحی خزاعی کا ذکر غیرہ،

۶/۶۷۶، قصہ فیہ؛ ۶/۶۸۰: نام نبوی پر تسمیہ محمد بن خزاعی؛ وغیرہ۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرتبہ محمد محی الدین عبدالحمید، دارالفکر قاہرہ، ۱۹۳۷ء، ۱/۱-۲۴ و مابعد: کے متعدد ابواب میں بھی وہ روایات و احادیث ابن اسحاق ہیں جن کی تائید میں شواہد بخاری پیش کیے گئے ہیں۔

سیرۃ ابن اسحاق مرتبہ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، اردو ترجمہ نقوش رسول نمبر جلد ۱۱، ص ۱۱، میں یہ سند و بیان بہت اہم ہے:

''(۲) احمد بن عبدالجبار نے یونس بن بُکیر کی وساطت سے بیان کیا کہ ابن اسحاق کی ہر حدیث قابلِ استناد ہے۔ اس نے یہ چیزیں مجھے املا کرائیں یا پڑھ کر سنائیں یا مجھ سے بیان کیں۔ اور غیر مستند مضامین جو ابن اسحاقؒ کو سنائے گئے تھے وہ اس نے نقل نہیں کے''۔

ڈاکٹر موصوف نے اپنی سیرتِ ابن اسحاق کو دو نسخوں سے مرتب کیا ہے: ایک بروایت یونس بن بُکیر (م ۱۹۹/ ۸۱۵) جس کو قطعہ اولیٰ اور نسخہ قرویین / رباط کہا ہے اور دوسرا / قطعۂ ثانیہ بروایتِ محمد بن سلمہ، جو دمشق کے مخطوطاتِ ظاہریہ کا ایک مخطوطہ ہے۔ امام ابن اسحاقؒ کے متعلقہ ابواب اولین نسخہ یونس بن بکیر میں بھی ناقص ہیں۔ بعض اوراق مخطوطہ ندارد ہیں اور بعض میں ابواب کا فرق ہے۔ موجود و دستیاب نسخہ سیرت ابن ہشام (م ۲۱۸/ ۸۳۳) کی تہذیب و تلخیص میں محفوظ ہے، جو زیاد بکائی (م ۱۸۳/ ۷۹۹) کی روایت پر مبنی ہے۔ اس قطعہ میں بہت سے ابوابِ کتاب المبتدا موجود نہیں ہیں، جو اس کے ناقص ہونے کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ ان ابواب کی تاریخی ترتیب بھی صحیح نہیں ہے۔

دل چسپ اور اہم بات یہ ہے کہ سیرتِ ابن اسحاقؒ کی روایت یونس بن بُکیر کی بہت سی روایات و احادیث دوسرے سیرت نگاروں اور شارحین نے اپنی کتابوں یا شروح میں نقل کی ہیں، مثلاً ڈاکٹر صاحب موصوف کے مطابق امام سہیلی (عبدالرحمٰن بن محمد، م ۵۸۱/ ۱۱۸۵) نے اپنی شرحِ سیرت 'الروض الانف' میں یونس بن بُکیر کا کثیر مواد نقل کیا ہے۔ (ص ۳۸۸ و مابعد) سہیلی کی الروض الانف کے مآخذ بہت سے ہیں،

جن میں تمام کتب حدیث وسیرت اور ادب وغیرہ شامل ہیں۔ان پر ایک تحقیقی کام بہت عمدہ ہوسکتا ہے۔سہیلی نے امام ابن اسحاق کے 'رواۃ' کتاب کے ذکر میں امام یونس بن بکیر شیبانی کو سب سے پہلے ذکر کیا ہے اور ان کے بعد پانچ مزید رواۃ کا۔ ان کے علاوہ بھی ان کے رواۃ تھے۔

امام سہیلی نے ابن اسحاق کی بہت سی روایات امام طبری کی تاریخ الرسل والملوک سے لی ہیں اور ان میں امام ابن اسحاق کے بعض رواۃ کا ذکر ہے، جیسے سلمہ بن فضل ۲/ ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۴، ومابعد۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام طبری کے بنیادی راوی ابن اسحاق اور سلمہ بن فضل بھی ہیں۔ بہرحال یونس بن بکیر کی روایات ابن اسحاق کی تصریح امام طبری نے کی ہے، جیسے ۲/ ۳۱۱: اسلام عفیف کندی، طبری (ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ الرسل والملوک مرتبہ محمد ابوالفضل ابراہیم، دارالمعارف مصر ۱۹۶۱ء۔)

۷ فتح الباری، ۶/ ۶۶۶-۶۷۶ ومابعد

۸ فتح الباری، ۶/ ۶۷۷-۶۷۸، حدیث ۳۵۱۸، ۴۹۰۵، ۴۹۰۷، میں غزوۂ مریسیع کے موقع پر مہاجرین وانصار کے دعویٰ جاہلیہ اور قبائلی عصبیت کی پکار کا ذکر ہے۔ ابن ہشام/ ابن اسحاق، ۱/۱۴۴ ومابعد: حلف الفضول پر بحث وروایات ہیں۔

۹ سیرت ابن اسحاق، ۱/۸۱ ومابعد، قصۃ عمرو بن لحی وذکر اصنام العرب، فتح الباری، ۶/ ۶۷۹ ومابعد: احادیث: ۳۵۲۰، ۳۵۲۱: اول الذکر میں فرمانِ نبوی ہے: ''عمرو بن لحی بن قمعۃ بن خندف، ابوخزاعۃ'' دوسری حدیث میں بحیرہ وسائبہ کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی حدیث مرفوع ہے: ''رأیت عمرو بن عامر بن لحی الخزاعی یجر قصبہ فی النار، وکان اول من سیّب السوائب''۔ سیرتِ ابن اسحاقؒ میں حضرت ابوہریرہؓ سے ہی مروی حدیث میں ہے: ''...رأیت عمرو بن لحی بن قمعۃ بن خندف یجر قصبہ فی النار ...الخ''۔ اس میں زیادہ بحث وتفصیل ہے۔ نیز ملاحظہ ہو بحثِ حافظ ابن حجر عسقلانی۔ بعض دوسرے شارحین نے بھی مفصل بحث کی ہے۔

۱۰ سیرت ابن اسحاق، ۱/۱۲۱ ومابعد؛ فتح الباری، ۶/ ۶۸۱ ومابعد: حدیث: ۳۵۲۲

۱۱ ابن اسحاق، ۱/۱۴۴ ومابعد؛ فتح الباری، ۶/۶۸۲ ومابعد: باب قصۃ زمزم وجہل العرب۔

۱۲ ابن اسحاق، ۱/۶۴ ومابعد؛ فتح الباری، ۶/۶۸۳-۶۸۵

۱۳ ازالہ، ۲/۵۴؛ قرۃ ۱۰۵-۱۰۶

۱۴ ازالہ، ۲/۵۷؛ قرۃ ۱۰۸، دوسری معلومات بھی ہیں۔

۱۵ ازالہ، ۲/۵۸؛ قرۃ ۱۰۶: ''کما ہو مبسوط فی سیرۃ ابن اسحاق

۱۶ ازالہ، ۲/۶۰ ۱۷ قرۃ، ۱۱۴

۱۸ قرۃ، ۱۱۶ ۱۹ ازالہ، ۲/۷۰؛ قرۃ ۱۱۶-۱۱۷

۲۰ ازالہ، ۲/۷۱، نیز ۶۷ (زوائد السیرۃ ابن ہشام؛ قرۃ ۱۱۷-۱۱۸

۲۱ ازالہ، ۲/۷۱-۷۲؛ قرۃ ۱۱۸-۱۱۹

۲۲ قرۃ، ۱۱۹-۱۲۰ ۲۳ ازالہ، ۲/۱۰۵-۱۲۱

۲۴ ازالہ، ۲/۱۱۷؛ قرۃ ۱۲۱-۱۲۳، ۱۲۴

۲۵ ازالہ، ۲/۱۱۸، قرۃ ۱۲۳-۱۲۴

۲۶ ازالہ، ۲/۱۱۹-۱۲۰ (زیادۃ علی السیرۃ ابن ہشام بھی)؛ قرۃ ۱۲۴-۱۲۵

۲۷ ازالہ، ۲/۱۲۱-۱۲۲، ۲/۳۳۴؛ قرۃ ۱۲۵-۱۲۶

۲۸ ازالہ، ۲/۱۲۲-۱۲۳؛ قرۃ ۱۱۴ مناقبِ صدیق میں؛ ۱۲۷ (بروایت مسلم بھی)

۲۹ ازالہ، ۲/۳۳۳ آخر حدیث تک؛ قرۃ ۱۲۷ ومابعد

۳۰ ازالہ، ۲/۱۲۴-۱۲۵؛ قرہ ۱۲۸

۳۱ ازالہ، ۲/۱۲۷؛ قرۃ ۱۲۸-۱۲۹

۳۲ ازالہ، ۲/۱۲۸، ۲/۳۳۳؛ قرۃ ۱۲۹-۱۳۰

۳۳ ازالہ، ۲/۱۲۹-۱۳۰؛ قرۃ ۱۳۰ (ابن اسحاق فی السیرۃ)

۳۴ ازالہ، ۲/۱۳۰-۱۳۶: وہ خلافت صدیقی کے واقعات کے مقابلہ میں بہت مفصل ہے۔ فتوحات واولیات اور کارناموں کا ذکر دوسرے مآخذ سے ہے۔

۳۵ ازالہ، ۲/۴۵۰-۵۰۰؛ قرۃ العینین، ۱۳۶-۱۳۸: میں اصل ماخذ حاکم ہیں۔

۳۶ ازالہ،۲/۵۰۱-۵۰۲ ۳۷ ازالہ،۲/۵۰۲

۳۸ ازالہ،۲/۵۰۳-۵۰۴ ۳۹ ازالہ،۲/۵۰۵

۴۰ ازالہ،۲/۵۰۷-۵۰۸ ۴۱ ازالہ،۲/۵۰۸-۵۰۹

۴۲ ازالہ،۲/۵۰۹ ۴۳ ازالہ،۲/۵۱۰

۴۴ ازالہ،۲/۵۱۱ ۴۵ ازالہ،۲/۵۱۱-۵۱۲

۴۶ ازالہ،۲/۵۱۲ ۴۷ ازالہ،۲/۵۱۲-۵۱۳

۴۸ ازالہ،۲/۵۱۳-۵۱۴ ۴۹ ازالہ،۲/۵۱۴

۵۰ ازالہ،۲/۵۱۵-۵۱۶ ۵۱ ازالہ،۲/۵۲۷

۵۲ قرۃ العینین، ۱۳۸-۱۴۹

۵۳ حواشی فتح الرحمٰن، سورۂ انعام، حاشیہ نمبر۴۳

۵۴ الفوز الکبیر، اردو ترجمہ رشید احمد انصاری، مکتبہ برہان، دہلی-۶، ۴۱ ومابعد؛ قرآنی قصوں اور عصری تاریخی واقعات کے علم وسمجھ کے لیے مفسرین نے یہی لکھا ہے۔

۵۵ الفوز الکبیر، فصل اسباب النزول، عربی ترجمہ: ۲۰۲-۲۰۳

۵۶ الفوز الکبیر، عربی ترجمہ مولانا سعید احمد پالن پوری، مکتبہ وحیدیہ دیوبند، ۱۳۹۴ھ، ۲۰۲-۲۰۳ نے سیرتِ نبویہ پر ذہبی کا نقد نقل کیا ہے اور واقدی پر بھی۔

☆☆☆

پاکستان میں

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:

جناب سجاد الٰہی صاحب، A-27، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور

Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (0)7280916

Email: Sammaradnan<talluadnan@yahoo.com>

بحث ونظر

بوڑھوں کے عافیت کدے اور اسلام

محمد رضی الاسلام ندوی

سماجی میدان میں جن چیزوں کا شمار موجودہ دور کی اہم کارگزاریوں میں ہوتا ہے ان میں سے ایک عمر رسیدہ شہریوں (SENIOR CITIZENS) کے لیے رفاہی اور ثقافتی اداروں کا قیام ہے۔ان اداروں کو DAY CARE CENTRES, OLD AGE HOMES, RETIREMENT NURSING HOMES, اور PAID HOME CARE جیسے خوب صورت نام دیے گئے ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ ان اداروں نے سماج کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے۔ ان میں معمّر ،معذور اور بے سہارا افراد کی، جن سے ان کے اپنے بھی منہ پھیر لیتے ہیں، مناسب دیکھ بھال کی جاتی ہے، انھیں سکون ، اطمینان اور آزادی کا ماحول فراہم کیا جاتا ہے اور وہاں اپنے ہم عمروں کے ساتھ ان کی زندگی کے آخری ایام بڑی خوشی ومسرت کے ساتھ کٹ جاتے ہیں ۔ بہ ظاہر یہ ایک اہم انسانی خدمت اور موجودہ دور کی ایک بڑی یافت (ACHEIVMENT) معلوم ہوتی ہے،لیکن اس کے پیچھے کرب والم کا جو اتھاہ سمندر موج زن ہوتا ہے وہ عموماً لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتا ہے۔

یہاں ہم پہلے اس معاملہ میں موجودہ دور کی کوششوں، اس کے محرکات اور نتائج کا بہت ہی اختصار کے ساتھ جائزہ لیں گے، پھر اسلام نقطۂ نظر واضح کریں گے۔

نوعیتِ مسئلہ

بڑھاپا انسانی زندگی کا ایک فطری مرحلہ ہے۔ ہر شخص، جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ اپنی عمر کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے بڑھاپے کو پہنچتا ہے۔ اس مرحلے میں اس کے جسمانی قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں اور اس کی دماغی اور فکری صلاحیتیں بھی کم

زور پڑ جاتی ہیں۔ وہ حصول معاش کے لیے تگ ودو کے قابل نہیں رہ جاتا۔ یہاں تک کہ جب اس کی جسمانی کم زوری میں مزید اضافہ ہوتا ہے تو وہ اپنے روز مرہ کے کاموں کی انجام دہی کے لیے بھی دوسروں کے سہارے کا محتاج ہو جاتا ہے۔ لیکن موجودہ دور کی نئی نسل اپنی زندگی کو بہتر اور خوش گوار بنانے میں اس قدر مصروف ہے کہ اسے اپنے بزرگوں کو سہارا دینے کی فرصت نہیں رہ گئی ہے۔ اس کے پاس موقع نہیں ہے کہ ان کے ساتھ کچھ وقت گزارے، ان سے بات چیت کر سکے، ان کے دکھ درد کو سن سکے اور ان کی ضروریات پوری کر سکے۔ اس صورت حال میں یہ بزرگ بھرے خاندان میں ہونے کے باوجود تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ افرادِ خاندان کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہنے کے باوجود ان کی جانب سے ہم دردی، غم گساری اور اپنائیت سے محرومی کا احساس انھیں کاٹے کھاتا ہے۔ وہ رنج والم کی مجسّم تصویر بن جاتے ہیں اور گھٹ گھٹ کر اپنی زندگی کے آخری دن کاٹنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اس سماجی المیہ نے ضرورت پیدا کی کہ ان عمر رسیدہ افراد کی دیکھ ریکھ کا انتظام کیا جائے اور ان کی پسند کا ماحول فراہم کیا جائے۔ اس کے نتیجے میں بوڑھوں کے عافیت کدے (OLD AGE HOMES) قائم کیے گئے۔

'اولڈ ایج ہومس' کی تاریخ اور موجودہ صورت حال

اولڈ ایج ہومس اصلاً بیسویں صدی عیسوی کی پیداوار ہیں۔ انیسویں صدی سے قبل ان کا کوئی تصور نہیں تھا۔ بعد میں ایسے اداروں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ تاریخی طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۸۲۳ء میں فِلا ڈلفیا (امریکہ) میں INDIGENT WIDOWS AND SINGLE WOMEN'S SOCIETY کے نام سے اور ۱۸۵۰ء میں بوسٹن (امریکہ) میں HOME FOR AGED WOMEN کے نام سے بے سہارا خواتین کے لیے رفاہی ادارے قائم ہوئے۔ پھر بیسویں صدی میں ایسے اداروں کا قیام کثرت سے ہونے لگا اور خاص طور پر اس صدی کے نصف آخر میں اس معاملے میں

تیزی آئی اور بڑے پیمانے پر عمر رسیدہ افراد کی رہائش کے لیے مراکز قائم ہوئے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۵ء میں امریکا میں بوڑھوں کے لیے قائم نرسنگ ہومس کی تعداد گیارہ ہزار تھی۔ اس کے بعد کے پانچ سال میں مزید ایک ہزار کا اضافہ ہوا، جس سے ۲۰۱۰ء میں ان کی تعداد بارہ ہزار ہوگئی۔ متعدد یورپی ممالک کا بھی یہی حال ہے۔ اسپین میں تقریباً پانچ ہزار نرسنگ ہومس قائم ہیں۔ ان میں سے بیش تر پرائیوٹ ہیں، صرف چند ہی سرکاری سرپرستی میں چل رہے ہیں۔ ان نرسنگ ہومس میں سے زیادہ تر گزشتہ ایک دہائی میں قائم ہوئے ہیں۔ ۲۰۰۶ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ناروے، نیدرلینڈ اور ڈنمارک میں عمر رسیدہ افراد میں سے صرف چار فی صد ہی ایسے خوش قسمت ہیں، جنھیں اپنے بچوں کے ساتھ ان کے گھروں میں زندگی گزارنا نصیب ہوتا ہے، بقیہ اولڈ ایج ہومس میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اب مغربی ممالک میں بڑے بڑے Retirement Resorts قائم ہونے لگے ہیں، جن کے تمام مکین عمر رسیدہ افراد ہوتے ہیں، ان کے لیے ہر طرح کی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں، حتّٰی کہ ان کی خدمت گزاری کے لیے خودکار مشینوں (ROBOT NURSES) کا سہارا لیا جانے لگا ہے۔

ہندوستان کی صورت حال بھی دیگر ملکوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یوں تو یہاں اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر (۱۷۸۲ء) میں سب سے پہلے اولڈ ایج ہوم کے قیام کا سراغ ملتا ہے۔ مگر ابتدا میں اس کام کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان اداروں میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں بہت تیزی سے اس طرح کے ادارے قائم ہونے لگے۔ مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ایجنگ کے ایک سروے کے مطابق ہندوستان میں ۱۹۵۰ء سے قبل صرف ۹۶ اولڈ ایج ہومس تھے۔ بعد کی دو دہائیوں میں مزید ۹۴ ہومس کا اضافہ ہوا۔ پھر ہر دہائی میں سو سے زائد اولڈ ایج ہومس قائم ہوتے رہے، یہاں تک کہ ۱۹۹۵ء میں ان کی تعداد ۵۲۹ تک پہنچ گئی۔ ان میں سے ۲۰ فی صد ہومس صرف کیرلا میں تھے۔ کیرلا کے ساتھ تامل ناڈو، کرناٹک اور آندھرا پردیش کی ریاستوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو جنوبی ہند میں اولڈ ایج

ہومس کی تعداد پورے ملک کی مجموعی تعداد کا نصف تھی۔[1]

عمر رسیدہ افراد کی فلاح و بہبود کے لیے ایک سماجی تنظیم HELP AGE INDIA کے نام سے کام کرتی ہے۔ اس نے ۲۰۰۹ء میں ملک میں قائم اولڈ ایج ہومس کی ڈائرکٹری شائع کی ہے۔اس کے مطابق ان کی تعداد ۱۲۷۴ ہے۔جن ریاستوں میں ایسے ہومس کی تعداد سو سے زائد ہے وہ ہیں تامل ناڈو (۲۵۱) کیرلا (۱۸۲) مغربی بنگال (۱۶۴) مہارشٹرا (۱۳۳) اور آندھرا پردیش (۱۱۴)، جب کہ اسی تنظیم کے سروے کے مطابق ۱۹۹۸ء میں پورے ملک میں ان ہومس کی مجموعی تعداد سات سو تھی۔

Help Age India نے دہلی و اطراف کے اولڈ ایج ہومس کا بھی سروے کرایا ہے۔ اس کی رپورٹ نومبر ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی تھی اور انٹرنیٹ پر بھی موجود ہے۔سروے میں ۳۰ ہومس کا احاطہ کیا گیا۔ان میں سے ۴ سرکاری انتظام کے تحت ہیں، بقیہ کو غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs) چلاتی ہیں۔ان میں سے صرف ۱۵ فی صد پچاس سال پرانے ہیں، ۱۵ فی صد کا زمانۂ قیام بیس سال کے اندر ہے اور ۷۰ فی صد گزشتہ ۱۰ سال کے اندر قائم ہوئے ہیں۔

اس تفصیل سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اولڈ ایج ہومس کے تصور کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کتنی تیزی سے فروغ ملا ہے۔

فراہم کی جانے والی سہولیات

ان ہومس کا ایک اور پہلو سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ان میں عمر رسیدہ افراد کی ضرورت کی ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کھانے پینے کا معقول انتظام ہوتا ہے۔حفظانِ صحت کے وسائل فراہم کیے جاتے ہیں، مثلاً گارڈن، جوگنگ ٹریک (Jogging Track) یوگا وغیرہ۔علاج معالجہ کا بہتر نظم کیا جاتا ہے۔ذہنی

---

[1] How away from home: A survey of old age homes and inmates in Kerala, S. Irudaya Rajan, Centre for development studies, Thiruvananthapuram, Aug 2000 یہ سروے رپورٹ انٹرنیٹ پر موجود ہے۔

سکون اور تفریح کے لیے کامن روم اور ٹیلی ویژن، علمی ذوق کی آبیاری کے لیے لائبریری، ریڈنگ روم، کمپیوٹر روم اور عبادت کے لیے جگہ (Prayer Room) باہری دنیا سے رابطہ کے لیے ٹیلی فون اور انٹرنیٹ وغیرہ کی سہولیات دی جاتی ہیں۔ کچھ ہومس یہ خدمات مفت فراہم کرتے ہیں تو کچھ ان کے لیے فیس وصول کرتے ہیں۔ Help Age India کے مذکورہ بالا سروے کے مطابق دہلی کے ۳۰ ہومس میں سے ۱۴ اپنی خدمات مفت فراہم کرتے ہیں، ۱۰ فیس وصول کرتے ہیں اور ۶ ایسے ہیں جو عام طور سے تو فیس لیتے ہیں، لیکن کچھ افراد کو بلا معاوضہ اپنے یہاں داخلہ دیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ان ہومس میں عمر رسیدہ افراد کو ضرورت کی ہر چیز حاصل رہتی ہے۔ اگر محروم رہتے ہیں تو اپنوں کے قرب، نگہ داشت اور محبت سے۔ چنانچہ ان ہومس میں اس کا بھی نظم ہوتا ہے کہ ان میں رہنے والے کسی فرد کا انتقال ہو جائے تو پہلے اس کے بیٹے، بیٹی یا متعلقہ عزیز کو مطلع کیا جاتا ہے۔ اگر وہ خود اس کی آخری رسوم ادا کرنے میں دل چسپی لے تو اس کی نعش کو اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے، ورنہ ان ہومس کے مصارف پر ہی اس کی آخری رسوم ادا کر دی جاتی ہیں۔

بوڑھوں کی اپنے گھروں سے بے زاری کے اسباب

ہر شخص کو فطری طور پر اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے۔ وہاں وہ اپنی زندگی کے قیمتی ایام گزارتا ہے، اس لیے اس کے در و دیوار سے اسے انس ہوتا ہے اور افرادِ خانہ سے تعلقِ خاطر تو فطری ہے۔ اس کے باوجود وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنا پر عمر رسیدہ افراد اپنے گھروں سے بے زار ہو جاتے ہیں اور ان کے مقابلے میں اولڈ ایج ہومس کو ترجیح دیتے ہیں؟ غور کرنے سے اس کے چند اسباب معلوم ہوتے ہیں:

۱- عمر رسیدہ افراد کو اپنے بڑھاپے میں جتنی خبر گیری، نگہ داشت اور دیکھ بھال کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ انھیں گھر میں نہیں مل پاتی۔ ان کے بیٹے ملازمت اور روزگار کے مسائل میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ اپنے بزرگوں کی طرف پوری توجہ

نہیں دے پاتے۔ وہ زیادہ تر اوقات گھر سے باہر رہتے ہیں اور جب گھر آتے ہیں تو ان کی عافیت پسندی انھیں اپنے خول میں بند رکھتی ہے اور وہ اپنے آرام کو تج کر والدین کی خدمت پر آمادہ نہیں ہوتے۔

۲- گھر کا سربراہ باپ ہوتا ہے۔ وہ اس کا نظم ونسق چلاتا ہے۔ اس کے چھوٹے بڑے معاملات میں اس کی بات فیصلہ کن ہوتی ہے۔ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد بھی اس کی خواہش ہوتی ہے کہ تمام افراد خانہ اس کی بات مانیں اور اس کی پسند و ناپسند کو اپنی پسند و ناپسند سمجھیں۔ دوسری طرف بچے بڑے ہوجاتے ہیں تو وہ اپنی مرضی چلانا چاہتے ہیں۔ مزاجوں کا اختلاف بسا اوقات ٹکراؤ کی صورت پیدا کردیتا ہے۔ اس حال میں اگر بچے باپ کی کوئی بات نہ مانیں تو اسے اپنی سبکی محسوس ہوتی ہے اور گھر سے اس کا دل اچاٹ ہوجاتا ہے۔

۳- رشتوں کی اہمیت کا احساس کم ہوگیا ہے۔ بہو اپنے خسر کی اس طرح دیکھ بھال نہیں کرپاتی جس طرح شادی سے قبل اپنے باپ کی کرتی تھی، دوسری طرف خسر اپنی بہو سے ویسی خدمت کی امید رکھتا ہے جیسی اس کی اپنی بیٹی کرتی تھی۔ اگر بہو کسی اجنبی خاندان سے آتی ہے تو بسا اوقات اسے خسر سے کوئی اپنائیت اور اُنس نہیں ہوتا۔ وہ نہ صرف یہ کہ خود اپنے خسر کی دیکھ بھال نہیں کرتی، بلکہ اپنے شوہر کو بھی صراحتہً یا اشارۃً اس سے روکتی ہے۔

۴- والدین اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا کرتے ہیں، ان پر اپنی گاڑھی کمائی خرچ کرتے ہیں، خود تکلیفیں اٹھا کر انھیں آرام پہنچاتے ہیں، لیکن جب بچے بڑے ہوجاتے ہیں اور ان کے والدین بوڑھے اور سہارے کے محتاج ہوتے ہیں تو بچوں میں شکرگزاری کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ خودغرضی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ وہ اپنے والدین کو ان کے ان احسانات کا بدلہ نہیں دے پاتے جو انھوں نے ان کے ساتھ ان کے بچپن میں کیے تھے۔

۵- بسا اوقات مالی پریشانیاں بھی والدین کی خدمت اور دیکھ بھال میں

حارج ہوتی ہیں۔ بیٹے کی آمدنی کم ہوتی ہے۔ اس سے وہ اپنے بیوی بچوں کی کفالت ہی مشکل سے کر پاتا ہے، اس بنا پر والدین کی کما حقہ خدمت نہیں کر پاتا۔

کیرلا کے مذکورہ بالا سروے میں ایک سوال یہ بھی شامل کیا گیا تھا کہ آپ گھر ہوتے ہوئے اولڈ ایج ہوم کیوں آئے؟ ۶۷ فی صد افراد نے اس سوال کا یہ جواب دیا کہ گھر میں خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

کوئی ادارہ خاندان کا متبادل نہیں

عمر رسیدہ افراد کو اپنے گھروں میں اور اپنے عزیزوں کے درمیان چین وسکون نہ ملا تو ان کے لیے اولڈ ایج ہومس قائم کیے گئے۔ لیکن یہ مسئلے کا حقیقی اور پائیدار حل نہیں ہے۔ کہنے کو تو ان ہومس میں بوڑھوں کو ضرورت کی ہر چیز دستیاب رہتی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے عزیزوں کی محبت کے لیے ہر آن ترستے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ فطری خواہش اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب وہ خود کو اپنے خاندان کے درمیان پائیں اور اپنے عزیزوں کے ذریعے ان کی خبر گیری ہو۔ اسی وجہ سے سماجی ماہرین نے اولڈ ایج ہوم کے تصور کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور اس کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں امریکہ کے ایک سوشل تجزیہ کار Abraham Epstein نے اولڈ ایج ہومس کے بارے میں لکھا تھا:

> ''یہ ادارے صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ عمر رسیدہ افراد اب اس صنعتی دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہے۔ یہ رفاہی ادارے سرگرم زندگی گزارنے کے بعد روزینہ پانے والے افراد کی انتہائی اہانت اور تذلیل کی خوف ناک علامت ہیں''۔[1]

بوڑھوں کے لیے قائم ہونے والے یہ ادارے بہ ظاہر بڑے خوش نما معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کے پیچھے ان کے بارے میں کتنا حقارت آمیز تصور کارفرما ہے اس کا اظہار

---

[1] Abraham Epstein, The Challenge of the aged, Alfred A. Knopf, New York, 1929, p.128

جناب پی-کے-مشرا(P.K. Misra) نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مغرب میں اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اولڈ ایج ہومس پنشن، سوشل سیکوریٹی اور ہیلتھ کیر کی سہولیات فراہم کی گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اہم اقدامات ہیں، لیکن یہ تمام پروگرام اس تصور کے ساتھ چلائے گئے کہ بوڑھے اپنی زندگی جی چکے، اب بس انھیں کچھ مادّی سہولت اور جسمانی آرام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انھیں حاشیہ پر ڈال دیا گیا، سرگرم زندگی سے انھیں الگ تھلگ کر دیا گیا اور انھیں 'بے کار چیز' (Waste) کی کیٹیگری میں جگہ دے دی گئی''۔

اس کے مقابلے میں خاندان کے ادارہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بوڑھوں کی خبر گیری کا مطلب ہے قدامت پسندی اور انسانیت نوازی کی اہمیت کو اجاگر کرنا۔ اس سے یقیناً قوم کو طاقت حاصل ہوگی۔ بوڑھوں کی خبر گیری بہتر انداز سے خاندان کے دائرہ ہی میں ہوسکتی ہے، جب ان کے بیٹے بیٹیاں اس کو اپنی ذمہ داری اور فرض سمجھیں۔ کوئی ادارہ خاندان کا بدل نہیں بن سکتا''۔[1]

اسلام کا نقطۂ نظر

اسلام نے اس مسئلے کو بہت خوب صورتی سے حل کیا ہے۔ اس نے سماج میں عمر رسیدہ افراد کو عزت و احترام کا مقام دیا ہے، ان کے حقوق بیان کیے ہیں اور ان کے متعلقین کو ان کی ادائی کا پابند کیا ہے۔ ان تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے نتیجے میں مسلم حکم رانی کے دورِ عروج میں کبھی 'اولڈ ایج ہومس' قائم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ذیل میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلام کے ان اقدامات اور تعلیمات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

---

[1] Development Problems and Traditional Cultures: Reflections on the Management of the aged in India, P.K. Misra

بڑھاپا انسانی زندگی کا ایک فطری مرحلہ ہے

قرآن کریم میں تخلیقِ انسانی کے مراحل مختلف مقامات پر بیان کیے گئے ہیں اوران کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی خلاّقی ،علم اور قدرت پر استدلال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُم مِّن ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفاً وَشَيْبَةً يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ۔(الروم:۵۴)

اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمھاری پیدائش کی ابتدا کی، پھر اس ضعف کے بعد تمھیں قوت بخشی، پھر اس قوت کے بعد تمھیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

سورۂ مومن میں یہی مضمون کسی قدر تفصیل سے وارد ہوا ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلاً ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخاً وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّى مِن قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلاً مُّسَمًّى وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔ (المومن: ٦٧)

وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر وہ تمھیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے، پھر تمھیں بڑھاتا ہے، تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ، پھر اور بڑھاتا ہے، تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو۔

اس آیت میں پیدائش سے قبل اور پیدائش کے بعد دونوں کے مراحل کا بیان ہے۔ پیدائش سے قبل کے تین مرحلے مذکور ہیں: تراب (مٹی) نطفہ اور علقہ۔ تراب

سے، سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کی طرف اشارہ ہے۔ موخرالذکر دو مرحلوں کے علاوہ ایک تیسرے مرحلے (مضغہ) کا بیان سورہ الحج: ۵ اور سورہ المومنون: ۱۴ میں ہوا ہے۔ اوپر درج دونوں آیتوں میں پیدائش کے بعد کے تین مراحل کا تذکرہ ہے: بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ ان میں یہ بھی صراحت ہے کہ بچپن میں انسان کم زور و ناتواں رہتا ہے، جوانی میں طاقت ور و توانا ہوجاتا ہے، بڑھاپے میں پھر اس کے اعضائے بدن میں کم زوری و ناتوانی لوٹ آتی ہے اور وہ اسی طرح دوسروں کے سہارے کا محتاج ہوجاتا ہے جس طرح بچپن میں تھا۔ جب بڑھاپے میں مزید اضافہ ہوتا ہے تو انسان کی عقل بھی ماؤف ہوجاتی ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ختم ہوجاتی ہے۔ اس مرحلے میں وہ مزید ہم دردی اور توجہ کا مستحق ہوجاتا ہے۔ قرآن کریم میں اسے 'ارذل العمر'' (بدترین عمر) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفَّاکُمْ وَمِنکُم مَّن یُرَدُّ إِلَی أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْ لاَ یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئاً إِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ۔ (النحل: ۷۰)[1]

اور دیکھو اللہ نے تم کو پیدا کیا، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے، اور تم میں سے کوئی بدترین عمر کو پہنچادیا جاتا ہے، تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ حق یہ ہے کہ اللہ ہی علم میں بھی کامل ہے اور قدرت میں بھی۔

انسانی زندگی کے مختلف مراحل کی یہ تفصیل بتاکر قرآن انسانوں میں یہ احساس بیدار کرنا چاہتا ہے کہ وہ عمر رسیدہ افراد کے ساتھ بہتر سلوک کریں، ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں، ان کے کام آئیں اور ان کی ضرورتیں پوری کریں، اس لیے کہ عین ممکن ہے کہ وہ خود بھی بڑھاپے کی عمر کو پہنچیں تو دوسروں سے اسی برتاؤ کے متمنی ہوں۔

افرادِ خاندان کے درمیان قریبی اور گہرا تعلق

انسان جب بڑھاپے کی عمر کو پہنچتا ہے تو خود کو ایک بھرے خاندان میں پاتا ہے۔ اس کے بیٹے بیٹیاں جوان ہوچکے ہوتے ہیں۔ ان کی شادی کے نتیجے میں

[1] یہی مضمون کسی قدر تفصیل کے ساتھ سورۂ حج کی آیت ۵ میں بھی مذکور ہے۔

بیٹیاں دوسرے خاندان میں پہنچ جاتی ہیں اور دوسرے خاندانوں کی لڑکیاں اس کے گھر بہو بن کر آجاتی ہیں۔ پھر ان کی اولادیں ہوتی ہیں تو پوتوں، پوتیوں، نواسوں، نواسیوں کی شکل میں اس کے آنگن میں بچوں کا شور وغل اور ہنگامے سنائی دیتے ہیں۔ اس چیز کو قرآن انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل شدہ ایک نعمت قرار دیتا ہے:

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُم مِّنْ أَنفُسِکُمْ أَزْوَاجاً وَجَعَلَ لَکُم مِّنْ أَزْوَاجِکُم بَنِیْنَ وَحَفَدَةً وَرَزَقَکُم مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۔(النحل:۷۲)

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے تمھاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمھیں بیٹے پوتے عطا کیے اور اچھی اچھی چیزیں تمھیں کھانے کو دیں۔

وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَاء بَشَراً فَجَعَلَہُ نَسَباً وَصِھْراً وَکَانَ رَبُّکَ قَدِیْراً۔(الفرقان:۵۴)

اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا، پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے۔

افرادِ خاندان کے درمیان گہرا اور قریبی تعلق ہو تو انسان کو بڑی خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ شاداں و فرحاں رہتا اور زمانے کے مصائب و آفات کو بھول جاتا ہے۔ ان کا وجود اس کے دل کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک فراہم کرتا ہے۔ اسی لیے اہلِ ایمان اس کے متمنی اور سراپا دعا رہتے ہیں:

وَالَّذِیْنَ یَقُولُونَ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْیُنٍ۔ (الفرقان:۷۴)

جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے۔

رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم

نسب اور سسرالی تعلق کے نتیجے میں جو رشتے وجود میں آتے ہیں، اسلام انھیں خصوصی اہمیت دیتا ہے۔ یوں تو اس کی نظر میں تمام انسان بھائی بھائی ہیں، ایمان کا رشتہ مزید قربت و تعلق پیدا کر دیتا ہے، چنانچہ اگر کبھی انھیں کوئی ضرورت درپیش ہو تو ان کی مدد میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے، لیکن خونی رشتہ داروں کا حق ان سے بڑھ کر ہے۔ ان کے

ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، ان کے دکھ درد میں کام آنا اور ان کی ضرورتیں پوری کرنا صرف اخلاقی تقاضا ہی نہیں، بلکہ ایک ذمہ داری ہے، جسے لازماً ادا کرنا چاہیے۔

وَأُوْلُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ إِلَّا أَن تَفْعَلُوا إِلَى أَوْلِيٰئِكُم مَّعْرُوفاً۔ (الاحزاب:۶)[۱]

کتاب اللہ کی رؤ سے عام مومنین ومہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، البتہ اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہو۔

رشتہ داروں کا حق ادا کرنے کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيْتَآئِ ذِيْ الْقُرْبَى۔ (النحل:۹۰)

اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

دوسری طرف اہل قرابت سے تعلقات بگاڑنے کی ممانعت آئی ہے اور ان کے حقوق کی پامالی پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاتَّقُواْ اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُونَ بِهِ وَالأَرْحَامَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً۔ (النساء:۱)

اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو، اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مامن ذنب اجدر ان يعجل الله تعالىٰ لصاحبه العقوبة فى الدنيا، مع مايدّخر له فى الآخرة، من البغى وقطيعة الرحم۔[۲]

ظلم اور رشتہ کی پامالی سے بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں، جس پر اللہ تعالیٰ نے آخرت میں طے شدہ سزا کے ساتھ، اس کا ارتکاب کرنے والے کے لیے اس دنیا ہی میں سزا مقدّر نہ کر دی ہو۔

آئندہ صفحات میں والدین کے حقوق کے سلسلے میں اسلام کی تعلیمات پیش کی جائیں گی، ان شاء اللہ (باقی آئندہ)

---

[۱] یہی مضمون سورہ الانفال کی آیت ۷۵ میں بھی وارد ہوا ہے۔

[۲] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی النھی عن البغی، ۴۹۰۲، مسند احمد، ۵/۳۶، ۳۸

رویتِ ہلال- ایک تحقیقی جائزہ

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی

رمضان اور عیدین کے مواقع پر رؤیت ہلال کے سلسلے میں علماء امت کے درمیان جو اختلاف چلا آرہا ہے وہ امتِ مسلمہ کے لیے پریشان کن مسئلہ بنا ہوا ہے، جس کے نتیجہ میں جہاں رمضان کے روزوں میں تقدیم وتاخیر ہورہی ہے، وہیں یہ افسوسناک صورتحال دیکھنے میں آتی ہے کہ عیدین کے موقع پر ایک ہی شہر کے مسلمان دو دو، بلکہ تین تین دن عید مناتے ہیں۔اس صورت حال سے عوام ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ رؤیت ہلال کے سلسلے میں کس کی رائے شرعاً درست ہے؟ اس مسئلہ میں سوال یہ ہے کہ اختلافِ مطالع کا لحاظ کیے بغیر پورے عالم اسلام میں ایک ہی دن روزہ رکھا جائے اور ایک ہی دن عید منائی جائے، یا اختلاف مطالع کے پیش نظر تبدیلیٔ مطلع کی صورت میں مختلف دنوں میں روزہ رکھا جائے اور عید منائی جائے۔جمہور علماء کی رائے میں اختلافِ مطالع کا پاس ولحاظ رکھنا شرعاً ضروری ہے۔اس سلسلے کے دلائل درجِ ذیل ہیں:

(الف)۔کتاب اللہ سے استدلال :

۱-اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ — سو جو شخص اس مہینہ (رمضان) کو پائے اسے ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہیے۔ (البقرۃ:۱۸۵)

اس آیت کی تفسیر میں امام قرطبیؒ رقم طراز ہیں:''جب کوئی خبر دینے والا کسی مقام پر رؤیت ہلال کی خبر دے تو اس کی دو صورتیں ہوں گی۔یا تو وہ شہر قریب ہوگا یا دور۔

اگر مقامِ رؤیت قریب ہوتو حکم ایک ہی ہوگا اور اگر مسافت بعید ہوتو ایک جماعت نے کہا ہے کہ ہر شہر والے کے لیے اپنی ہی رؤیت قابلِ قبول ہوگی، حدیثِ کریب اس پر شاہد ہے''۔

شیخ صالح بن فوزان عبداللہ آل فوزانؒ نے لکھا ہے:

''ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت کی ابتداء اس وقت سے ہے جب ماہِ رمضان داخل ہونے کا علم حاصل ہوجائے۔ اور یہ علم تین ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ ۱- رؤیت ہلال رمضان ۔۲- رؤیت پر شرعی شہادت اور اس کی اطلاع کا حاصل ہونا۔۳- تیسویں شعبان کی رات چاند نظر نہ آنے پر شعبان کی تعداد مکمل کر لینا۔''[۲]

۲۔ دوسری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ (البقرۃ:۱۸۹)

لوگ آپ سے ہلال (نئے چاند) کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں کے اوقات کی تعیین اور حج کے وقت کی تعیین کا ذریعہ ہے۔

ہلال کی لغوی تحقیق:

ابوالعباس قرطبی نے لفظ ہلال کی لغوی تحقیق میں لکھا ہے:

اَصْلٌ اِسْتَهَلَّ مِنَ الْاِهْلَالِ اَلَّذِی هُوَ رَفْعُ الصَّوْتِ عِنْدَ رُؤْيَةِ الْهِلَالِ، ثُمَّ غَلَبَ عُرْفَ الْاِسْتِعْمَالِ فَصَارَ يُفْهَمُ مِنْهُ رُؤْيَةُ الْهِلَالِ، وَمِنْهُ سُمِّيَ الْهِلَالُ لِمَا كَانَ يُهَلُّ عِنْدَهُ''

استھل، الاہلال سے مشتق ہے جس کے معنی چاند دیکھنے کے وقت آواز بلند کرنے کے ہیں، پھر اس کا استعمال عرف میں صرف رؤیت ہلال کے لیے خاص ہوگیا۔

صاحب ''المنجد'' فرماتے ہیں: اَهَلَّ الْهِلَالُ چاند ظاہر ہوا۔ اَهَلَّ الشَهْرُ قمری مہینہ شروع ہوا۔ اَهَلَّ القَوْمُ الْهِلَالَ چاند دیکھنے کے وقت لوگوں نے آواز بلند کی۔ اھل

الصبی بچے نے رونے میں آواز بلند کی۔

مندرجہ بالا لغوی تحقیق سے یہ بات واضح ہے کہ ہلال کے معنی میں ظاہر ہونے اور واضح ہونے کا مفہوم مسلّم ہے۔اور ہلال عربی میں چاند کی اس ابتدائی شکل کو کہتے ہیں جو آسمان پر دکھائی دیتی ہے،فلکی چاند جو دکھائی نہیں دیتا، اس کو ہلال نہیں کہتے، اس کا اصطلاحی نام نیومون New Moon ہے،لہذا قرآن کریم نے تاریخ کی تعیین کا ذریعہ جس چیز کو قرار دیا ہے وہ دکھائی دینے والا ہلال ہے، نہ کہ فلکی یا حسابی چاند۔۵

ہلال دنیا میں پہلی بار نظر آنے کے عموماً ۲۴ گھنٹوں بعد قطبین کے علاوہ پوری دنیا میں نظر آجاتا ہے لیکن کبھی کبھی یہ وقفہ دو کی بجائے تین مختلف دنوں تک بھی بڑھ جاتا ہے۶

سبب نزول:

مذکورہ بالا آیت (البقرۃ: ۱۸۹) حضرت معاذ بن جبلؓ اور ثعلبہ بن غنمؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔ان دونوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا راز ہے کہ چاند دھاگہ کے مانند باریک طلوع ہوتا ہے، پھر بڑا ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ بدرِ کامل بن جاتا ہے، پھر گھٹنے لگتا ہے، یہاں تک کہ پہلے کی طرح باریک ہوجاتا ہے ایک حال پر باقی نہیں رہتا،تب یہ آیت نازل ہوئی۔۷

مذکورہ آیت کریمہ میں اللہ نے بیان فرمایا کہ چاند کے ذریعہ لوگ اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لئے اوقات مقرر کرتے ہیں، روزہ افطار، حج، ماہواری کے ایام، عدت، قرض اور اجرتیں وغیرہ بہت سی شرطوں کی مدت کے سارے مواعید چاند ہی کے ذریعے معلوم کیے جاتے ہیں

New Moon کی حقیقت:

ایک مرتبہ ایک سعودی شہزادہ نے خلائی طیارہ Rocket کے ذریعہ خلا کی بلندیوں میں جاکر نئے چاند کو دیکھنا چاہا،مگر واپس آکر اس نے اس امر ہی کی تائید کی کہ نو مولود چاند قابلِ دید نہ تھا، کیوں کہ اس وقت اس کا روشن حصہ سورج کی سمت میں ہوتا

ہے۔اس وقت نہایت پیچیدہ SOPHISTICATED اور طاقتور دوربینوں کی مدد سے بھی اسے نہیں دیکھا جاسکتا۔۸؎

۳- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَاءً وَالْقَمَرَ نُوْرًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالحِسَاب. (یونس:۵)

وہ اللہ ایسا ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو (بھی) نورانی بنایا اور اس کی (چال کے لیے) منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرلیا کرو۔

اس آیت کی تفسیر میں حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں: ''چاند کی ان منازل سے اور رفتار سے ہی مہینے اور سال بنتے ہیں جس سے تمہیں ہر چیز کے حساب کرنے میں آسانی رہتی ہے، علاوہ ازیں دنیوی منافع اور کاروبار بھی ان منازل قمر سے وابستہ ہیں۔دینی منافع بھی اس سے حاصل ہوتے ہیں، اسی طرح ہلال سے حیض ونفاس، صیام رمضان، اشہر حرم اور دیگر عبادات کی تعیین ہوتی ہے، جن کا اہتمام ایک مومن کرتا ہے''۔۹؎

۴- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْم. (یس: ۳۹)

اور چاند کے لیے منزلیں مقرر کیں یہاں تک کہ وہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی۔

یعنی چاند کی ۲۸ منزلیں ہیں۔روزانہ ایک منزل طے کرتا ہے، پھر دو راتیں غائب رہ کر تیسری رات کو نکل آتا ہے۔جب یہ چاند آخری منزل پر پہنچتا ہے تو بالکل باریک اور چھوٹا ہوجاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی ہو، جو سوکھ کر ٹیڑھی ہوجاتی ہے، چاند کی انہیں گردشوں سے سکان ارض اپنے دنوں مہینوں اور سالوں کا حساب اور اپنے اوقات عبادات کا تعین کرتے ہیں۔۱۰؎

(ب)۔احادیث نبوی سے استدلال:

۱- حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لاتَصُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوُا الْھِلَالَ وَ لَا تُفْطِرُوْ حَتّٰی تَرَوْہُ، فَاِنْ غُمَّ عَلَیْکُمْ فَاقْدُرُوْا لَہٗ'' ھٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِی وَ فِی لَفْظٍ لَہٗ ''فَأَکْمِلُوْا الْعِدَّۃَ ثَلَاثِیْنَ.[۱۱]

یعنی جب تک چاند نہ دیکھ لو روزہ نہ رکھو اور جب تک چاند نہ دیکھ لو روزہ نہ چھوڑو اور اگر بادل کی وجہ سے چاند نہ دیکھ سکو تو اس کا اندازہ لگالو۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: تیس (۳۰) دن کی گنتی پوری کرلو۔

ابن منظور نے غَمَّ الھلالُ غمًّا کا معنی یہ بیان کیا ہے: سَتَرَہُ الغَیْمُ وغیرُہ فَلَمْ یُرَ [۱۲] یعنی چاند نظر نہ آنے کا سبب مطلع کا ابر آلود ہونا ہی نہیں، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور سبب سے مطلع صاف ہونے کے باوجود چاند نظر نہ آئے۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّا اُمَّۃٌ اُمِّیَّۃٌ لَا نَکْتُبُ وَ لَا نَحْسِبُ، الشَّھْرُ ھٰکَذَا وَ ھٰکَذَا یَعْنِی مَرَّۃً تِسْعًا وَّ عِشْرِیْنَ وَ مَرَّۃً ثَلَاثِیْنَ۔[۱۳]

بے شک ہم ان پڑھ امت ہیں، نہ لکھتے ہیں اور نہ حساب کرتے ہیں۔ مہینہ اتنا اور اتنا ہے۔ یعنی کبھی ۲۹ دن کا ہوتا ہے اور کبھی ۳۰ دن کا۔

۳- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

صُوْمُوْا لِرُؤْیَتِہٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْیَتِہٖ فَاِنْ غُبِیَ عَلَیْکُمْ فَأَکْمِلُوْا عِدَّۃَ شَعْبَانَ ثَلَاثِیْنَ''[۱۴] و فی روایۃ لمسلم ''فَاِنْ غُمَّ عَلَیْکُمْ فَصُوْمُوْا ثَلَاثِیْنَ یَوْمًا.

(رمضان کا) چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور (شوال کا) چاند دیکھ کر روزہ چھوڑو اگر تم پر بادل چھا جائے (اور چاند نظر نہ آئے) تو شعبان کے ۳۰ دنوں کی گنتی پوری کرو۔ (بخاری و مسلم) یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ اور مسلم کی روایت ہے کہ: اگر تم پر بادل چھا جائے تو ۳۰ دنوں کے روزے رکھو۔

۴- حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلْفِطْرُ یَوْمَ یُفْطِرُ النَّاسُ وَالْأَضْحٰی یَوْمَ یُضَحِّی النَّاسُ.[۱۵]

عیدالفطر اس روز ہے جب لوگ روزے مکمل کرتے ہیں اور عیدالاضحیٰ اس روز ہے جب لوگ قربانیاں کرتے ہیں۔

۵۔ حضرت کریب سے مروی ہے کہ حضرت ام الفضل نے انہیں ملک شام حضرت امیر معاویہ کے پاس بھیجا۔ میں ملک شام پہنچا اور ان کی حاجت پوری کی ۔ ابھی میں وہیں تھا کہ رمضان کا چاند نظر آ گیا، میں نے چاند کو جمعہ کی رات میں دیکھا اور مہینہ کے آخر میں مدینہ منورہ آیا حضرت ابن عباسؓ نے مجھ سے پوچھا: تم نے چاند کب دیکھا تھا؟ میں نے کہا: جمعہ کی رات۔ پھر انھوں نے فرمایا: کیا تم نے دیکھا تھا؟ میں نے کہا: ہاں میرے علاوہ اور لوگوں نے بھی دیکھا اور روزہ رکھا اور حضرت معاویہؓ نے بھی چاند دیکھا اور روزہ رکھا۔ پھر انھوں نے فرمایا: ہم نے تو ہفتہ کی رات چاند دیکھا ہے، پس ہم ۳۰ دن پورا کریں گے۔ یا ہم اس کو دیکھ لیں، میں نے عرض کیا: کیا معاویہؓ کا چاند دیکھنا اور ان کا روزہ رکھنا کافی نہیں ہے؟ فرمایا: نہیں، نبی کریم ﷺ نے ہمیں ایسا ہی حکم دیا ہے۔[۱۶]

(ج) صحابہ کرام اور تابعین عظامؒ کا تعامل:

صحابۂ کرام میں حضرت عمر بن الخطاب و ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ عنھم نے رؤیت ہلال کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس پر ابن عابدین نے 'احکام هلال رمضان' ابن السبکی نے العلم المنشور فی اثبات الشهور اور دوسرے مسلم ماہرین فلکیات نے رسالے لکھے ہیں۔ شیخ بخیت نے ارشاد اهل الملة الی اثبات الأهلة، شیخ طنطاوی جوہری نے 'الهلال' نامی کتاب تصنیف کی ہے۔

۱۔ دور خلافت عمرؓ: اختلافِ مطالع کا اعتبار حضرت عمرؓ کے دور میں بھی تھا۔ بعض صحابہ کرامؓ اپنی رؤیت کے حساب سے نویں ذی الحجہ کو میدان عرفات میں پہنچ گئے، مگر مکہ مکرمہ کی رؤیت کے حساب سے وہ دسواں دن تھا (یوم النحر) اور وقوفِ عرفہ ختم ہو چکا تھا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں حکم دیا کہ وہ قربانی دے کر واپس لوٹ جائیں، اگلے سال پھر حج کے لیے آئیں۔[۱۷]

۲۔ خلفاء راشدین کے دور میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی کہ دار الخلافہ میں چاند

نظر آنے پر مملکت کے دور دراز علاقوں میں قاصدین کے ذریعہ اطلاع دی گئی ہو اور وہاں کے لوگوں کو رمضان کے آغاز یا اختتام کا حکم دیا گیا ہو۔ حالانکہ اس زمانہ میں تیز رفتار خبر رسانی کا ذریعہ 'برید' موجود تھا۔ اس کے باوجود اس کا نظم نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شرعاً مطلوب نہیں ہے۔

۳۔ روی عن عکرمة انه قال ''لِكُلِّ اَهْلِ بَلَدٍ رُؤْيَتُهُمْ لِمَا رَوَى كُرَيْبٌ. ۱۸؎ یعنی حضرت عکرمہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حدیث کریب کی روشنی میں کہا کہ ہر شہر والوں کے لئے ان کی اپنی رؤیت ہوگی۔

۴۔ ایک شہر کی رؤیت کو دوسرے تمام شہر والوں کے لیے لازم قرار دینا درست ہوتا تو حضرت عمرؓ اور دیگر خلفائے اسلام اپنے یہاں چاند دیکھنے کے بعد تمام شہر والوں کو اس کی تعمیل کا حکم دیتے اور اس کا خصوصیت کے ساتھ اہتمام کرتے اور لوگوں کو لکھ کر اس سے آگاہ کرتے، اس لیے کہ دینی امور سے ان کا لگاؤ اور ان کی دلچسپی کسی سے مخفی نہیں۔ ۱۹؎

۵۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ''ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ صحابہ کرام و تابعین عظام کے زمانے میں ہمیشہ بعض اسلامی شہروں میں چاند پہلے اور بعض شہروں میں اس کے بعد دکھائی دیتا تھا اور یہ روزمرہ کی ان باتوں میں سے ہے، جن میں کسی تبدیلی کا سوال نہیں۔ اس پس منظر میں اس طرح کی صورتِ حال پیدا ہوئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوسکتا کہ ان تک بعض دوسرے علاقوں کی خبر مہینہ کے اندر کسی وقت پہنچے اور اگر ان کے لیے قضا کرنی ضروری ہوتی تو وہ اس کا پتہ لگانے میں حد درجہ اہتمام سے کام لیتے کہ تمام عالم اسلام میں چاند کی رؤیت کہاں کس وقت ہوئی؟ جیسا کہ وہ اپنے اپنے شہروں میں اس کے دیکھنے کا اہتمام کرتے تھے پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اکثر رمضانوں میں انہیں اپنے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا رکھنی پڑتی اور اگر ایسا ہوتا تو یہ چیز ہم تک نقل ہو کر ضرور پہنچتی، لیکن اس طرح کی کوئی بھی بات جب ہم تک نہیں پہنچی تو اس کا مطلب ہے کہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے اور سرے سے اس کی کوئی دلیل موجود

نہیں ہے، حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا حدیث اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے۲۰

شیخ الاسلام نے یہ بات اس ضمن میں تحریر فرمائی ہے کہ اگر کسی شہر میں رؤیت نہ ہوئی ہو اور رؤیت والے شہر سے خبر بھی نہ پہنچ سکی ہو جس کی وجہ سے ان کا ایک روزہ چھوٹ گیا ہو تو ایسی صورت میں ان پر روزہ کی قضا واجب نہیں ہے۔ البتہ صحابہ وتابعین کے اس تعامل سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ایک شہر کی رؤیت دوسرے شہر کے لیے لازم نہیں ہے۔

(د) محدثین عظام کا نقطۂ نظر:

محدثین عظام اختلافِ مطالع کی بنیاد پر ہر شہر اور ہر علاقہ کے لئے اپنی رؤیت ہی کو تسلیم کرتے تھے۔ کبھی بھی ان لوگوں نے اُم القری کی رؤیت کو سارے عالم کے لئے لازم کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کی مساعیٔ جمیلہ یہی تھیں کہ ہر علاقے کے لوگ اپنے اپنے علاقے میں رؤیت ہلال کی بنیاد پر روزہ رکھیں اور عید منائیں۔ ذیل میں محدثین کرام کے نقطہ نظر کی وضاحت پیش کی جارہی ہے۔

۱- امام نوویؒ نے صحیح مسلم میں یہ باب باندھا ہے۔ "**بابُ بیانِ أنَّ لکلِ بلدٍ رؤیتُھم وأنھم اِذَا رأوا الھلالَ ببلدٍلایثبتُ حکمُہ لما بَعُدَ عَنْھُمْ**" یعنی اس چیز کا بیان کہ ہر علاقہ کے لیے وہاں کے لوگوں کی رویت کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر کسی علاقہ کے لوگ چاند دیکھ لیں تو اس کا حکم دوٗر کے لوگوں کے لیے ثابت نہیں ہوگا۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں:

"لٰکِنَّ ظَاھِرُ حَدِیْثِہٖ أَنَّہُ لَمْ یَرُدَّہُ لِھٰذَا وَاِنَّمَا رَدَّہُ لِأَنَّ الرُّؤْیَۃَ لَا یَثْبُتُ حُکْمُھَا فِی حَقِّ الْبَعِیْد "۲۱

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے مسافت بعیدہ اور اختلاف مطالع کی وجہ سے کریب کی خبر کو رد کر دیا نہ کہ ''خبر واحد'' ہونے کی وجہ سے۔

امام نوویؒ نے دوسری جگہ لکھا ہے: جب ایک شہر والوں نے چاند دیکھا ہے اور دوسرے شہر والوں نے نہیں دیکھا تو اس صورت میں اگر دونوں شہر قریب قریب ہوں تو ان دونوں کا حکم اختلاف کے بغیر ایک ہی ہوگا اور اگر دونوں شہر دور دور ہوں تو دو صورتیں

ہوسکتی ہیں۔(۱) دوسرے شہر والوں پر روزہ رکھنا ضروری نہیں ہوگا۔(۲) ضروری ہوگا کہ روزہ رکھیں۔ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت ہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔۲۱- الف

۲ - امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس طرح باب باندھا ہے '' **باب اذا رؤي الهلال في بلدٍ قبلَ الآخرين بليلةٍ** '' (باب اس بیان میں کہ جب چاند کسی شہر میں دوسروں سے ایک دن قبل نظر آجائے تو کیا کیا جائے؟) اس حدیث کی شرح میں صاحب عون المعبودؒ فرماتے ہیں:

> ''ابن عباسؓ کے قول **هكذا امرنا رسول الله** ا سے احتمال ہے کہ مراد یہ ہو کہ افطار کے سلسلہ میں خبر واحد کو قبول نہ کریں۔ دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ ہم اپنی ہی رؤیت کا اعتبار کریں گے۔ محدث کے باب سے دوسرے معنی کی طرف رجحان ظاہر ہوتا ہے۔''۲۲

۳ - امام ترمذیؒ نے اپنی جامع میں یہ باب باندھا ہے '' **باب لكل أهل بلد رؤيتهم** ''۔ حدیث کریب نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

العملُ عَلَى هَذَا الْحَدِيْثِ عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ اَنَّ لِكُلِّ بَلَدٍ رُؤْيَتُهُمْ ۲۳ یعنی اہل علم کے مابین اس حدیث کے مطابق عمل ہے کہ ہر علاقے کی رویت کا اعتبار ہوگا۔۲۳

شارح ترمذی مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ نے لکھا ہے: جن شہروں کے مطالع میں اختلاف نہیں ہے ان میں سے ایک کی رؤیت دوسرے شہر کے لئے لازماً تسلیم کی جائے گی۔ایک روایت میں یہی قول اہل عراق کا بتایا گیا ہے۔۲۴

۴ - امام نسائیؒ نے: 'باب اختلاف أهل الآفاق في الرؤية' (باب اس حکم کے بیان میں کہ جب مختلف ممالک کے باشندے رؤیت ہلال کے سلسلے میں مختلف ہوں) کے تحت حدیث کریب (۲۱۱۳) نقل کی ہے۔ امام سندیؒ نے سنن نسائی کے حاشیہ میں لکھا ہے:

''اِنَّ الْمُرَادَ بِهٖ أَن لاَّ تُقْبَلَ شَهَادَةُ الْوَاحِدِ فِی حَقِّ الْاِفْطَارِ أَوْ أَمَرَنَا أَنْ نَعْتَمِدَ عَلَی رُؤْیَةِ أَهْلِ بَلَدِنَا وَلاَ نَعْتَمِدَ عَلَی رُؤْیَةِ غَیْرِهِمْ وَاِلَی الْمَعْنَی الثَّانِی تَمِیْلُ تَرْجَمَةُ الْمُصَنِّفِ وَغَیْرُهُ لٰکِنَّ الْمَعْنَی الْأَوَّل مُحتَمَلٌ فَلاَ یَسْتَقِیْمُ الْاِسْتِدْلاَلُ اِذِ الْاِحْتِمَالُ یُفْسِدُ الْاِسْتِدْلاَلَ کَاَنَّهُمْ رَأَوْا اَنَّ الْمُتَبَادِرَ هُوَ الثَّانِیْ فَبَنَوْا عَلَیْهِ الْاِسْتِدْلاَلَ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ''۲۵

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہم افطار کے سلسلہ میں خبر واحد کو قبول نہ کریں یا ہم اپنے شہر کی رؤیت پر ہی اعتماد کریں اور دوسرے شہر کی رؤیت کو تسلیم نہ کریں۔ دوسرے معنی کی طرف ہی محدث اور دوسروں کا میلان ور جحان ظاہر ہوتا ہے۔لیکن پہلا مطلب بھی محتمل ہے، لہٰذا احتمال ہونے کی وجہ سے استدلال درست نہیں ہوگا۔ گویا انہوں نے متبادر مفہوم کو دیکھا اور اسی پر استدلال قائم کرلیا۔ واللہ اعلم

۵- امام ابن خزیمہؒ نے یہ باب قائم کیا ہے: ''اَلدَّلِیْلُ عَلٰی اَنَّ الْوَاجِبَ عَلٰی اَهْلِ کُلِّ بَلَدَةٍ صِیَامُ رَمَضَانَ لِرُؤْیَتِهِمْ لاَ رُؤْیَةِ غَیْرِهِمْ'' یعنی اس بات پر دلیل کہ ہر علاقہ والے کے لیے اپنی ہی رؤیت پر رمضان کے روزے کا آغاز کرنا ضروری ہے اور اس کے تحت حدیث کریب کو نقل کیا ہے اور اپنے موقف کی دلیل کے لئے اسی سے استدلال بھی کیا ہے۔۲۶

۶- ابن ابی شیبہؒ نے اپنی کتاب مصنف میں اس طرح تبویب کی ہے: ''وَفِی الْقَوْمِ یَرُوْنَ الْهِلاَلَ وَلاَ یَرَاهُ الآخَرُوْنَ'' یعنی قوم کے کچھ لوگ دیکھیں اور کچھ لوگ چاند نہ دیکھیں تو کیا حکم ہے؟

ایک اور حدیث جس کی روایت ابن ادریس نے عبداللہ بن سعید سے کی ہے کہ مدینہ میں لوگوں نے رؤیت ہلال کا ذکر کیا اور کہا کہ 'اہل استارہ' نے چاند دیکھا تو سالم اور قاسم نے کہا کہ ''مَالَنَا وَلأَهْلِ اِسْتَارَة'' یہ رؤیت اہل استارہ کے لئے ہے ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔۲۷

۷- امام بغویؒ نے فرمایا ہے: جب چاند کسی علاقہ میں دیکھا گیا ہو اور دوسرے

علاقہ والوں نے ایک دن بعد دیکھا ہو تو اہل علم کا اس میں اختلاف ہے۔ ان میں سے ایک بڑی جماعت کا موقف یہ ہے: 'اِنَّ لِکُلِّ اَھلِ بَلَدٍ رُؤْیَتُھُمْ' یعنی ہر علاقہ کے لیے وہاں کے لوگوں کی رویت کا اعتبار ہوگا۔ تابعین میں سے قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ بن عمر، عکرمہ اور محدثین میں سے اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ نے حدیث کریب سے ہی استدلال کیا ہے۔ ۲۸

حدیث کریب کی روایت بیہقی نے اپنی السنن الکبری (**باب الھلال یری فی بلد ولا یری فی آخر**) اور دارقطنی نے اپنی سنن (**باب الشھادۃ علی رؤیۃ الھلال**) میں کی ہے۔

۸- محدث العصر ناصر السنۃ علامہ محمد ناصر الدین البانی نے اس سلسلے میں یہ نصیحت کی ہے: ''جب تک تمام ممالک اسلامیہ کسی نقطۂ اتحادِ رؤیت پر متفق نہ ہو جائیں اس وقت تک ہر ملک کے باشندوں کو میری رائے میں اپنے ملک اور اپنی حکومت کے ساتھ روزہ رکھنا چاہئے۔ اختلاف کر کے الگ الگ نہ بٹ جائیں کہ کوئی اپنے ملک کی رؤیت پر اور کوئی دوسرے ملک کی رؤیت پر عمل کرنے لگے۔ اپنے ملک کی رؤیت پر روزہ رکھنا چاہیے، خواہ دو ایک دن آگے پیچھے ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ایسا نہ کرنے سے ایک ہی ملک والوں کے درمیان اختلاف وانتشار کے وسیع ہونے کا خطرہ ہے، جیسا کہ بدقسمتی سے بعض عرب ممالک میں ہو رہا ہے۔ **واللہ المستعان**''۲۹

(ھ) فقہاء کرام کی آراء :

۱۔ صاحب ہدایہ نے اپنی کتاب 'مختارات النوازل' میں ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے: ''ایک شہر والوں نے رؤیت ہلال کے بعد ۲۹ روزہ رکھے اور دوسرے شہر والوں نے چاند کی رؤیت کی بنا پر تیس روزے رکھے تو اگر ان دونوں شہروں میں مطلع کا اختلاف نہ ہو تو ۲۹ روزے رکھنے والوں کو ایک دن کی قضا کرنی ہوگی اور اگر دونوں شہروں کا مطلع جداگانہ ہو تو قضا کی ضرورت نہیں''۔

۲- قدوری میں ہے کہ اگر دوشہروں کے درمیان ایسا تفاوت ہو کہ مطلع تبدیل نہ ہوتا ہو تو اس صورت میں رؤیت لازم ہوگی۔

۳- علامہ عبدالحئی لکھنوی کا فیصلہ اس طرح ہے: ''عقل ونقل ہر دو اعتبار سے سب سے صحیح مسلک یہی ہے کہ ایسے دوشہر، جن میں اتنا فاصلہ ہو کہ ان کے مطالع بدل جائیں، جس کا اندازہ ایک ماہ کی مسافت سے کیا جاتا ہے، اس میں ایک شہر کی رؤیت دوسرے شہر کے لئے معتبر نہیں ہونی چاہیے اور قریبی شہروں میں جن کے مابین ایک ماہ سے کم کی مسافت ہو، ان میں ایک شہر کی رؤیت دوسرے شہر کے لئے لازم وضروری ہوگی''۔[۳۰]

۴۔ علامہ ابن رشدؒ نے لکھا ہے کہ ''امام مالکؒ کے مدنی شاگردوں نے ان سے یہ نقل کیا ہے کہ اگر ایک شہر میں رؤیت ہو جائے تو دوسرے تمام شہر والوں پر یہ رؤیت لازم نہ ہوگی، الّا یہ کہ حاکم وقت اس کو لازم قرار دے تو اس کی بات مانی جائیگی'' اور یہی بات ابن ماجشون اور امام مالک کے اصحاب میں سے مغیرہ نے کہی ہے[۳۱]

۵۔ علامہ ابن قدامہؒ (متوفی ۶۲۰ھ) فرماتے ہیں: ''جب ایک شہر والے چاند دیکھ لیں تو سارے شہر والوں پر روزہ رکھنا لازم ہے۔ یہ لیث بن سعد اور بعض شوافع کا قول ہے'' اس میں سے بعض نے کہا کہ اگر دوشہروں کے مابین اتنی قریبی مسافت ہو جس کی وجہ سے مطالع کا اختلاف لازم نہ آتا ہو جیسے بغداد اور بصرہ۔ ان دونوں شہر والوں پر روزہ رکھنا لازم ہے، کسی ایک جگہ کی رؤیت کی وجہ سے۔ اگر دونوں شہروں کے مابین دوری ہے جیسے عراق وحجاز اور شام، تو ہر شہر والوں کے لیے ان کی اپنی رؤیت ہی معتبر ہوگی''۔

۶۔ عکرمہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حدیث کریب سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا: ہر شہر والوں کے لئے ان کی اپنی رؤیت ہوگی یہی قاسم، سالم اور اسحاق بن راھویہ رحمھم اللہ کا مذہب ہے۔[۳۲]

۷۔ علامہ ابن کثیرؒ نے فرمایا: ''امام شافعیؒ کے مذہب میں یہ مشہور ہے کہ جب کسی شہر والوں نے چاند دیکھا تو ان پر اور ان لوگوں پر جن کا مطلع ان کے ساتھ متحد ہے، روزہ رکھنا واجب ہے اور اگر مطلع کا اختلاف ہو تو وجوب کا حکم عام نہیں ہوگا''[۳۳]

(و) جمہور علماء کی رائے اور ان کی مساعی جمیلہ:

۱- علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں: ''علماء امت کا اجماع ہے کہ رؤیت ہلال کے سلسلے میں بہت زیادہ مسافت کی دوریاں رکھنے والے دوملکوں کے مابین ایک دوسرے کی رؤیت کا اعتبار نہ ہوگا، جیسے اندلس جوخراسان سے دور ہے ان دونوں کی رؤیت کا باہمی اعتبار نہ ہوگا، الّا یہ کہ ملک اگر بڑا ہو تو ایسے ملک جن کے علاقے کی سرحدیں مسلمانوں کے شہر سے قریب ہیں تو وہاں کی رؤیت باہم معتبر ہوگی۔[۳۴]

۲- ڈاکٹر رواس قلعجی رقم طراز ہیں: حدیث کریب کی روشنی میں دو مسئلے ایسے ہیں جن میں عبداللہ بن عباسؓ کی رائے کا بیان کرنا ازحد ضروری ہے:

(۱) ممالک کے مختلف ہونے سے مہینہ کی ابتدا اور انتہا کا مختلف ہونا۔ حضرت ابن عباسؓ کی رائے یہ تھی کہ کسی ملک میں مہینہ کا آغاز دوسرے ملک کے آغاز سے مختلف ہوسکتا ہے، لہٰذا جس دن اہل شام رؤیت ہلال کی بنا پر روزہ رکھیں گے اس دن اہل حجاز روزہ رکھنے کے مجاز نہ ہوں گے اس لئے کہ ان کے یہاں چاند نظر نہیں آیا۔ (۲) مہینہ کا آغاز رؤیت ہلال سے ہوگا، نہ کہ چاند کے بڑے اور چھوٹے ہونے سے۔ لہٰذا اگر چاند نظر نہ آئے تو نئے مہینہ کے آغاز کے لئے تیس دن پورے کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ ابوالبختری سعید بن فیروز فرماتے ہیں کہ ہم عمرہ کے لیے نکلے۔ جب ہم وادی نخلہ پہنچے تو ہمیں چاند نظر آیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ تیسری رات کا چاند ہے، بعض نے کہا کہ دوسری رات کا چاند ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہماری ملاقات ابن عباسؓ سے ہوئی میں نے کہا: ہم نے چاند دیکھا، بعض نے اسے تیسری رات کا بتایا تو بعض نے دوسری رات کا شمار کیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے دریافت کیا: آپ لوگوں نے چاند کس رات دیکھا تھا، ہم نے کہا: فلاں رات کو۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کو رؤیت کے لیے دراز کر دیا۔ وہ اسی رات کا ہے جس رات کو تم نے دیکھا ہے[۳۵]

۳- صاحب سبل السلام فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: اِذَا

رَأیْتُمُوْہُ فَصُوْمُوْا '' یہ مخصوص لوگوں سے خطاب ہے۔اس مسئلہ میں اہل علم کے متعدد اقوال ہیں۔ان اقوال میں زیادہ قریب یہی ہے کہ کسی شہر والوں کے لئے اور اس سے متصل علاقوں کے لیے اس جگہ کی رؤیت کو لازم قرار دیا جائے۔''اِذَا رَأیْتُمُوْہُ'' خطاب لأناس مخصوصین به و فی المسئلة أقوال و الأقرب لزوم اهل بلد الرؤیة وما یتصل بها من الجهات التی علی سمتها ۳۶۔مزید یہ فرماتے ہیں کہ''اہل شام کی رؤیت اہل حجاز کے لئے قابل قبول نہیں ہوگی۔حضرت کریبؒ نے ۳۱واں روزہ (شام کے حساب سے) رکھا۔اس لیے کہ اہل مدینہ کے حساب سے وہ تیسواں روزہ تھا۔۳۷

۴- جناب شمس پیرزادہ رقم طراز ہیں:''ہندوستان کا مطلع ایک ہی ہے، لہٰذا ہندوستان میں عام طور پر تاریخیں یکساں رہتی ہیں، البتہ رمضان اور شوال کے چاند کے سلسلہ میں ایک حصہ اور دوسرے حصے کے درمیان اختلاف رہتا ہے لیکن چونکہ عام طور سے یکسانیت پائی جاتی ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ پورے ملک کے لیے ایک مطلع کا حکم نہ لگایا جائے۔مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنو نے واضح طور سے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ایک ملک کے جس گوشے میں بھی چاند دیکھا جائے وہ پورے ملک کے لئے معتبر ہوگا۔ ہندو پاک کے بیشتر حصوں اور بعض قریبی ملکوں مثلاً نیپال وغیرہ کا مطلع ایک ہی ہے۔ علمائے ہندو پاک کا عمل ہمیشہ اس پر رہا ہے۔اور غالبا تجربہ سے بھی یہی بات ثابت ہے''۔۳۸

۵- حافظ صلاح الدین یوسف نے لکھا ہے''ایک علاقے کی رؤیت دوسرے علاقے کے لئے معتبر ہوگی یا نہیں اس میں علماء کا اختلاف ہے اور دونوں گروہوں کے استدلال کی بنیاد یہی حدیث ہے۔صُوْمُوْا لِرُؤیَتِهِ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤیَتِهِ (بخاری ومسلم) ایک تیسرا گروہ ہے جس کا موقف یہ ہے کہ جو علاقے مطلع کے اعتبار سے قریب قریب ہیں، یعنی ان کے طلوع وغروب میں زیادہ فرق نہیں ہے ان میں ایک علاقے کی رؤیت دوسرے علاقوں کے لئے کافی ہے۔ پاکستان میں تمام مکاتبِ فکر کے علمائے کرام نے تقریبا یہی موقف اختیار کیا ہے، جس کا اظہار مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے فیصلہ کی صورت میں مسلسل کئی سالوں سے ہورہا ہے۔ پاکستان میں کسی ایک جگہ رؤیت ہلال کا

اگر شرعی شہادتوں کی روشنی میں اثبات ہو جاتا ہے تو یہ کمیٹی اسے پورے ملک کے لئے کافی سمجھتی ہے۔ بہرحال یہ ایک معتدل موقف ہے جس پر عمل کی گنجائش ہے۔۳۹

(ز) فتاوی علمائے حجاز و ہند:

۱۔ اللجنة الدائمة للبحوث العلمية و الافتاء، هيئة العلماء کی قرار داد نمبر۲، تاریخ ۱۳۹۲/۸/۱۳ھ

سوال نمبر ۳۶۸۶: کیا یہ ممکن ہے کہ امریکہ والے سعودی عرب کی رؤیت پر چاند دیکھے بغیر روزہ رکھ لیں؟

جواب: سپریم علماء کونسل کی طرف سے اس سلسلے میں ایک قرارداد منظور ہو چکی ہے، جس کا مضمون یہ ہے: (۱) چاند کے مطالع کا اختلاف یقینی طور پر حسّاً و عقلاً معلوم ہے۔ اختلاف صرف اس مسئلہ میں ہے کہ مطالع کا اعتبار ہوگا یا نہیں (۲) اختلاف مطالع کا اعتبار یا عدم اعتبار ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس بارے میں وسعت ہے۔ اور جو اختلاف موجود ہے وہ ان علماء کی طرف سے ہے جو اس باب میں اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔ اور یہ اجتہاد اسی قسم کا ہے کہ اگر مجتہد نے حقیقت کو پالیا تو دوگنا ثواب پائے گا، ورنہ صرف ایک اجر کا مستحق ہوگا۔ دونوں فریقوں کا استدلال بھی ایک ہی جیسے نصوص سے ہے اور وہ ہیں: قرآن مجید کی آیت: يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ (سورۂ بقرہ/۱۸۹) اور حدیث نبوی صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهِ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِه (بخاری و مسلم)

لجنۃ دائمۃ نے بہت سے اعتبارات کا خیال کرتے ہوئے اور یہ سوچ کر کہ اس مسئلہ میں اختلاف کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے برے نتائج کا خطرہ ہو، کیونکہ اس دین کو ظاہر ہوئے ۱۴ سو سال ہو گئے، لیکن آج تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں امت محمدیہ نے ایک دن کے لئے بھی کسی ایک جگہ کی رؤیت پر اتفاق کر کے عمل کیا ہو، اسی وجہ سے سعودی سپرم علماء کونسل یہ بہتر سمجھتی ہے کہ اس بارے میں اب تک جو عمل چلا آ رہا ہے اسی کو باقی رکھا جائے اور اتحاد رؤیت کے موضوع کو بلا وجہ نہ چھیڑا جائے۔ ہر مسلم ملک کو

اس بات کا اختیار ہو کہ وہ اس بارے میں اپنے علماء کی رائے سے کوئی فیصلہ کر سکے۔اس بارے میں علماء کے دو اقوال میں سے جس کو چاہیں اختیار کرلیں، کیونکہ ہر فریق کے پاس اس کے موقف پر دلیل موجود ہے۔

(۳)۔رؤیت ہلال کو حساب فلکی سے ثابت کرنے کے معاملے میں کتاب وسنت اور علماء کے اقوال کی روشنی میں علماء کونسل اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ علم نجوم کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے **صُوْمُوْا لِرُؤْیَتِهِ وَاَفْطِرُوْالِرُؤْیَتِه** (بخاری ومسلم) کے مضمون کی کئی حدیثیں مروی ہیں، اس بناپر علم نجوم کے حساب کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

[عبدالعزیز بن باز (صدر)،عبداللہ بن قعود (رکن)، اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء، رياض]

۲۔سوال نمبر ۱۲٦٦۔کیا اپنے شہر کے مسلمانوں کی مخالفت ،روزہ رکھنے اور عید منانے میں جائز ہے؟

جواب : الحمدللہ رؤیت کا ثبوت ملنے کی صورت میں ان پر واجب ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ روزہ رکھیں اور ان کے ساتھ ہی عید منائیں ۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایاہے:''**صُوْمُوْا لِرُؤْیَتِهِ وَاَفْطِرُوْالِرُؤْیَتِهِ فَاِنْ غُمَّ عَلَیْکُمْ فَاَکْمِلُوْا الْعِدَّةَ** ..... ''(بخاری ومسلم) یعنی روزہ کی ابتدااور انتہا مجرد آنکھ سے چاند دیکھنے یا ایسے آلات سے دیکھنے پر جو چاند دیکھنے میں آنکھ کے لئے معاون ہوں، کرنا چاہئے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روزہ اس دن ہے جب تم سب روزہ رکھوگے اور عیدالفطر اس دن ہے جب تم سب عید مناؤگے اور عیدالاضحیٰ اس دن ہے جس دن تم سب عیدالاضحیٰ مناؤگے۔[۴۰]

۳ - شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوریؒ کا فتوی ہے:

''کسی مقام میں رمضان یا شوال کا چاند دیکھا گیا تو اس مقام رؤیت سے دور مشرق میں واقع دوسرے مقام والوں کے لئے ان کی رؤیت اس وقت معتبر ہوگی جبکہ ان دوسرے مقامات کے مطالع مقامِ رؤیت کے مطلع سے مختلف نہ ہوں۔ مقام رؤیت سے

دور مشرق میں واقع بلاد وامصار کے حق میں مغربی مقام کی رؤیت کے اعتبار وعدم اعتبار کے معاملے میں اتحاد واختلافِ مطالع کا لحاظ ضروری ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے مدینہ میں شام (جو مدینہ سے شمال مغرب میں واقع ہے) کی رؤیت کا اعتبار بظاہر اس لئے نہیں کیا تھا کہ مدینہ کا مطلع 'مطلع شام' سے مختلف ہے۔ بعض علمائے فلکیات کا کہنا ہے کہ پانچ سو میل کے قریب کی مسافت پر مطلع مختلف ہو جاتا ہے۔ بنابریں ہندوستان کے کسی مغربی مقام کی رؤیت اس کے مشرقی حصے مثلاً بہار و بنگال کے حق میں معتبر نہ ہوگی۔''[۴۱]

۴- شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حکم شرعی گواہی اور رؤیت پر موقوف ہے۔ لہٰذا اہل مکہ کی رؤیت ساری دنیا کے لئے ناممکن ہے، یہی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا بھی موقف ہے۔ فرمانِ الٰہی: فَالآنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَاكَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوْا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۸۷) اور فرمان رسول ﷺ: اِذَا اَقْبَلَ الَّيْلُ مِنْ هَا هُنَا وَاَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هَاهُنَاوَ غَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ اَفْطَرَ الصَّائِمُ ۔ (بخاری: ۱۹۵۴، مسلم: ۱۱۰۰) یہ حکم ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے عام ہے۔ اسی طرح فرمان الٰہی: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۔ اور فرمان رسول ﷺ: اِذَارَأَيْتُمُوْاهُ فَصُوْمُوْا وَاِذَارَأَيْتُمُوْهُ فَاَفْطِرُوْا ، یہ حکم عام ہے۔ یہی قول کہ ایک مقام کی رویت دوسرے مقام کے لیے مستلزم نہیں ہے، فکر صحیح اور قیاس صحیح کے مطابق راجح ہے۔ توقیتِ شہری کا قیاس توقیتِ یومی پر ممکن ہے۔[۴۲]

۵- جامعہ دارالسلام عمرآباد کا فتوی برائے سید شاہ امیر الحق قادری سرقاضی دارالسلطنت میسور، ۱۹۵۰/۱۰/۱۹

سوال: کیا حیدرآباد دکن کی رؤیت کو پورے ہندوستان کے لئے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟

جواب: نماز عیدین کے متعلق ایسا انتظام قائم کرنا کہ تمام روئے زمین پر ایک ہی تاریخ اور ایک ہی روز میں عیدین کی نماز ادا کی جائے، قطعاً ناممکن ہے، اس لئے کہ

اختلاف مطالع کی وجہ سے مشرق ومغرب کی تاریخ اور دنوں میں فرق ہونا ضروری ہے۔ صاحب 'تصریح' نے تحریر کیا ہے کہ ہر وہ مغربی ملک جو کسی مشرقی ملک سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہے (1600 KM، دنیا کا محیط چوبیس ہزار میل ہے) دونوں کے طلوع وغروب میں ایک گھنٹے کا فرق واقع ہوتا ہے۔ اس حساب سے قطبین کے علاوہ تمام آفاق مائلہ میں ۲۴ گھنٹے کا فرق ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں تمام روے زمین پر ایک ہی دن اور ایک ہی تاریخ میں نماز عید کی ادائیگی ناممکن ہے۔ علاوہ ازیں زمین کے مدوّر ہونے اور آفتاب کے گرد گردش کرنے کی وجہ سے کرۂ زمین پر اوقات بھی یکساں نہیں ہوسکتے۔ کسی مقام پر صبح کا وقت ہوتا ہے تو کسی مقام پر ظہر کا اور کہیں مغرب کا تو کسی مقام پر عشاء کا، ایسی حالت میں ایک ہی تاریخ کا تعین ناممکن ہے۔ وہ تجارتی جہاز جو مشرق سے مغرب کی طرف سفر کرتے ہیں انٹرنیشنل لائن (IDL) پر پہنچ کر اپنی تاریخ میں ایک دن کا اضافہ کر لیتے ہیں اور وہ جہاز جو مغرب سے مشرق کی طرف سفر کرتے ہیں اس لائن پر پہنچ کر اپنی تاریخ میں ایک دن کم کر لیتے ہیں۔ پس مذکورہ بالا تشریح کے مطابق تمام کرۂ زمین میں نماز عید ایک ہی روز اور ایک ہی تاریخ میں قطعاً ادا نہیں ہوسکتی۔ باقی رہا یہ سوال کہ تمام ہندوستان میں ایک ہی دن میں نماز عید ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ تو یہ کچھ مشکل معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ ہندوستان کے مشرقی ومغربی شہروں میں تقریباً پونے دو گھنٹوں کا فرق واقع ہوتا ہے۔ لہٰذا ادائیگی نماز کے لئے ایک ہی وقت کا تعین اگر نہیں کیا جاسکتا تو کم از کم ایک ہی تاریخ کا پورے ہندوستان میں تعین کیا جاسکتا ہے اور یہ امت مسلمہ کے اتحادِ عمل ویگانگی، مقاصد شان توحید کے لئے فی الواقع ایک مفید ومؤثر مظاہرہ ہوگا۔ قال اللہ تعالی : وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَلَا تَفَرَّقُوْا (سورۂ آل عمران/۱۰۳)

صاحبِ درِّمختار کا یہ قول 'یَلْزَمُ اَھْلَ الْمَشْرِقِ بِرُؤْیَةِ الْمَغْرِبِ' صرف ایک ملک کے باشندوں کے لئے ہے، ورنہ اگر پوری زمین کے لئے لیا جائے تو قطعاً صحیح نہیں ہوگا۔ مشاہدہ شاہد ہے کہ اگر کبھی مدراس میں 29 کا چاند دیکھا گیا ہے تو اس کے شمال میں اور مغرب میں ایک ہزار سے زاید میل کے فاصلہ پر بھی اسی روز 29 کا چاند دیکھا گیا ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہلال کا طلوع تمام ہندوستان میں ایک ہی روز ہوتا ہے، گوکسی مانع کی وجہ سے بعض مقام پرنظر نہ آ سکے، پس تمام ہندوستان میں ایک ہی روز عید کی نماز ادا کی جاسکتی ہے اور اس کے انتظام کے لئے وہی صورت بہتر ہوسکتی ہے جو سوال میں درج ہے۔یعنی حیدرآباد دکن کی رؤیت کو ہندوستان کے لئے تسلیم کرکے بذریعہ ریڈیو اعلان عام کردیا جائے۔ واللہ اعلم.....

کتبہ: عبید الرحمن عاقل رحمانی استاذ جامعہ دارالسلام عمر آباد

الجواب صحیح: غضنفر حسین شاکر نائطی ،عبدالواجد عمری رحمانی ،محمد نعمان اعظمی ، عبدالسبحان اعظمی عمری (غفراللہ لھم)

حرفِ آخر:

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں شریعت ایسے اصول اور قواعد بتاتی ہے جس میں لوگوں کے لئے سہولت ہو اور وہ بغیر کسی مشقت وحرج کے اس پر عمل کرسکیں، کیونکہ احکام شریعت سہولت پر مبنی ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرۃ:۱۸۵) اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمہارے ساتھ آسانی کا ہے سختی کا نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے روزے کے سیاق میں ہی ساری امت سے فرمایا کہ شریعت کے احکام پر عمل کرنے میں سہولت مقصود ہے۔اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اَلدِّيْنُ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهُ ۴۳ یعنی یقیناً دین آسان ہے جو دین میں بے جا سختی کرتا ہے۔ دین اس پر غالب آجاتا ہے۔یعنی انسان مغلوب ہوجاتا ہے اور دین پر عمل ترک کردیتا ہے۔اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ قَالَهَا ثَلَاثًا۔ ۴۴ اپنی طرف سے دین میں سختی کرنے والے ہلاک ہوگئے۔آپ ﷺ نے ۳ مرتبہ یہ ارشاد فرمایا۔اور آپ ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: تم دین میں غلو کرنے سے بچو، پچھلی قومیں دین میں غلو کرکے ہلاک ہوگئیں۔ ۴۵

احادیث شریفہ میں رؤیت بصری (آنکھ سے دیکھنے کو) ہی کو معتبر مانا گیا، نہ کہ محض وجود ہلال (New Moon) کو، جسے غیر مرئی چاند کہا جاتا ہے، کیونکہ مرئی چاند دیکھنے میں ہی ساری امت کے لیے سہولت اور آسانی ہے۔ اگر غیر مرئی چاند کو معیار تسلیم کیا گیا تو یہ بات چند مخصوص افراد ہی کو معلوم ہو سکے گی اور اکثریت کے لیے اس کا دیکھنا محال ہوگا اور یہ تکلیف مالا یطاق ہوگی۔ روزہ رکھنے اور روزہ نہ رکھنے کے لیے رؤیت ہلال کو سبب تسلیم کرنے کی صورت میں جہاں رویت ہوگی وہاں روزہ کا حکم ہوگا اور جہاں رویت نہ ہوگی وہاں روزہ کا حکم نہیں ہوگا۔ یہ قاعدہ کلیہ پوری دنیا والوں کے لیے ہے۔ جس علاقہ کے مسلمانوں نے چاند نہیں دیکھا ان کے علاقے میں رؤیت ہوئی ہی نہیں تو رمضان کا مہینہ آیا ہی نہیں، وہ روزہ کیوں رکھیں؟ محض کسی ایک جگہ کی رؤیت کو سارے دنیا کے مسلمان تسلیم کرلیں تو یہ قیاسِ فاسد ہے۔

روزہ اور عید غالب اکثریت کے ساتھ ہی معتبر ہے۔ عیدین اجتماعیت کا سبق دیتی ہیں۔ اسلامی عبادت میں اجتماعیت کا تصور موجود ہے۔ تنہا ایک آدمی چاند دیکھ کر عید اپنے طور پر نہیں منا سکتا، بلکہ اسے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نمازوں کی ادائی کے لیے لوگوں کی غالب اکثریت کی موافقت ضروری ہے۔ دو چار افراد کا جماعت سے الگ ہوکر روزہ شروع کر دینا یا عید منانا نہ روزہ ہے نہ عید ہے۔ اسی لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے حدیث "صَوْمِكُمْ يَوْمَ تَصُوْمُوْنَ وَفِطْرِكُمْ يَوْمَ يُفْطِرُوْنَ۔ (ابوداؤد) کے بارے میں فرمایا کہ بعض اہل علم نے اس حدیث کی یہ تشریح کی ہے: "اِنَّمَا مَعْنىٰ هَذَا الصَّوْمُ وَ الْفِطْرُ مَعَ الْجَمَاعَةِ وَ عِظَمِ النَّاسِ"۔ ۴۶ یعنی روزہ اور عید جماعت اور لوگوں کی اکثریت کے ساتھ ہی معتبر ہے۔

بلاشبہ مسجد حرام، جو اسلامی ممالک بلکہ سارے عالم کے مسلمانوں کے لئے ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ قبلہ بھی ہے، لیکن وہاں کی رؤیت کو اتحاد امت کا ذریعہ سمجھنا شرعاً غلط ہے، کیونکہ رؤیت ہلال کے لئے سب سے اہم رکاوٹ اختلاف مطالع، اختلاف رؤیت اور جغرافیائی حیثیت وغیرہ ہے۔ اتحاد امت کے لئے بنیادی ضرورت یہ

ہے کہ امتِ محمدیہ تمام فقہی ، گروہی اور مسلکی اختلافات سے بالا تر ہوکر عقیدہ کی بنیاد پر متحد ہو۔ اخوت ایمانی کو مضبوط سے مضبوط تر بنائے۔ اتباع سنت کے ساتھ ساتھ شرکیہ امور سے کلی طور پر اجتناب کرے۔ اس سے امت کی وحدت کو تقویت پہنچے گی، نہ کہ صرف ایک ہی دن میں سارے عالم میں عید منانے سے وحدت قائم ہوگی۔ عید مسلمانوں کے لئے عبادت اور شکر کا ایک طریقہ ہے، جو صرف رؤیت بصری پر ہی منحصر ہے ۔ یہ عیدیں کرسمس اور دیپاولی کی طرح کوئی میلہ یا تہوار نہیں ہے کہ وقت سے پہلے ہی تقویم کے ذریعہ اس کا اعلان کردیا جائے اور نہ یہ ممکن ہے کہ شمسی تاریخوں کی طرح قمری تاریخوں کا کیلنڈر بنایا جائے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ رؤیت ہی کی بنیاد پر کوئی مہینہ ۲۹ کا اور کوئی مہینہ ۳۰ کا ہوگا۔ اور یہ کس مہینہ میں ۲۹ اور کس مہینے میں ۳۰ کا ہوگا اس کی تحدید نہیں کی گئی ۔ امت مسلمہ میں یہ اختلاف قدیم ہے۔ اس پر بار بار مسلسل کوششیں کی گئیں، ملکی اور مقامی سطح پر سیمینار منعقد ہوئے، لیکن علمائے امت کا چودہ سو سال سے عدم اتفاق خود اس بات پر دلیل ہے کہ ایک شہر کی رؤیت تمام عالم کے لئے ناممکن ہی نہیں، بلکہ امر محال ہے۔ رؤیت ہلال میں عالمی وحدت پیدا کرنے کی کوشش رسول اکرم ﷺ کی صحیح احادیث، علماء محققین، حنفیہ و مالکیہ و شافعیہ و حنابلہ اور علم ہیئت جدیدہ اور جغرافیہ جدیدہ کے خلاف ہے

جب عالم اسلام میں نمازوں کے اوقات میں فرق و تفاوت کو وحدت کے منافی نہیں سمجھا جاتا تو رؤیت ہلال کے حساب سے الگ الگ دن عیدیں اور رمضان کے آغاز کو عالم اسلام کی وحدت کے منافی کیوں سمجھا جارہا ہے۔ یہ نظریہ سرے سے غلط ہے کہ سعودی عرب کے ساتھ دیگر اسلامی ممالک روزہ رکھیں اور عید منائیں۔ رؤیت ہلال کا مسئلہ قدرت کی جانب سے مقرر کردہ نظام ہے۔ اس میں انسان بے بس ہے اور وہ شریعت کا پابند ہے۔ ہمیں چاہئے کہ فکر و نظر کو شریعت کے تابع بنائیں، نہ کہ اپنے بنائے ہوئے افکار و نظریات کو صحیح ٹھہرانے کے لئے شریعت سے دلائل جمع کرنے کی کوشش کریں۔

اضافہ از ادارہ

اس موضوع پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ایک قیمتی اور موثر تحریر ذیل میں درج کی جارہی ہے۔ انھوں نے ایک موقع پر عیدالفطر کا خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا:

''بعض حلقے یہ خیال بڑے زور شور سے پھیلا رہے ہیں کہ عید اسلامی اتحاد کا ایک اہم نشان ہے۔ اس لیے تمام مسلمانوں کی عید لازماً ایک دن ہونی چاہیے۔ ان میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی عید ایک دن ہو اور کچھ دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ پاکستان کے تمام مسلمانوں کی عید تو ایک ہی دِن ہونی ضروری ہے۔ لیکن درحقیقت یہ فکر ونظر کی غلطی ہے۔ دین سے ناواقفیت کی بنا پر ایسی باتیں کی جارہی ہیں اور یہ باتیں زیادہ تر وہ لوگ کررہے ہیں جو رمضان کے روزے تو نہیں رکھتے، مگر عید کے معاملے میں اسلامی اتحاد کی انھیں بڑی فکر ہے۔

اِن حضرات کو پہلی غلط فہمی تو یہ لاحق ہے کہ عید اُن کے نزدیک کرسمس یا ہولی یا دیوالی کی طرح کوئی تہوار ہے یا پھر یہ کوئی قومی جشن ہے جسے مسلمانوں کے قومی اتحاد کا نشان بنایا گیا ہے۔ حالاں کہ دراصل عید کا تعلق ایک عبادت سے ہے جو رمضان کے آغاز سے شروع ہوتی ہے اور رمضان کے خاتمہ کے بعد اللہ تعالیٰ کے شکر کے طور پر دو رکعت نماز پڑھ کر ختم کی جاتی ہے۔ شریعت کے صریح احکام کی رؤ سے اِس عبادت کا آغاز اُس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک قابل اطمینان طریقہ سے یہ معلوم نہ ہو کہ رمضان شروع ہو چکا ہے اور اس کا اختتام بھی اُس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک ایسے ہی قابل اطمینان طریقہ سے یہ علم نہ ہو جائے کہ رمضان ختم ہو چکا ہے۔ قرآنِ مجید کا صاف حکم ہے کہ:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیَ أُنزِلَ فِیهِ الْقُرْآنُ ..... فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ۔ (البقرہ: ۱۸۵) ''رمضان کا مہینہ وہ ہے، جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے..... پس تم میں سے جو شخص اِس مہینے کو پائے (یا اِس میں موجود ہو) وہ اس کے روزے رکھے۔''

یہ آیت قطعی طور پر اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ رمضان کا مہینہ جب سے شروع ہو اور جب تک وہ رہے، ہر مسلمان کو اس کے روزے رکھنے چاہئیں اور اِس مہینے

کے روزوں کی تکمیل کیے بغیر کسی عید کا ہرگز کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اِس معاملے میں اصل چیز مسلمانوں کا اتحاد نہیں ہے، بلکہ ماہ رمضان کا اختتام ہے، جس کا اطمینان حاصل کرنا عید کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اب یہ خیال رہے کہ رمضان ایک قمری مہینہ ہے، جس کا انحصار رویتِ ہلال پر ہے اور اِس کے بارے میں نبی ﷺ کی واضح ہدایت موجود ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی روزے ختم کرو۔ لیکن اگر مطلع صاف نہ ہو تو تیس روزوں کی تعداد پوری کرو، اِلّا یہ کہ دو قابلِ اعتماد گواہ یہ شہادت دیں کہ اُنھوں نے چاند دیکھا ہے۔ حضور ﷺ نے اس ارشاد میں دو باتیں صاف متعین فرما دی ہیں: ایک یہ کہ رویت کی شہادت اُس وقت درکار ہوگی جب کہ مطلع صاف نہ ہو، دوسرے یہ کہ اِس صورت میں خبر نہیں، بلکہ دو عادل گواہوں کی شہادت پر رویت کا فیصلہ کیا جائے گا اور شہادت کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ تار یا ٹیلیفون یا ریڈیو پر نہیں ہوسکتی، اس کے لیے گواہوں کا سامنے موجود ہونا ضروری ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی عید ایک دن ہونی چاہیے وہ تو بالکل ہی لغو بات کہتے ہیں۔ کیوں کہ تمام دنیا میں رویت ہلال کا لازماً اور ہمیشہ ایک ہی دن ہونا ممکن نہیں ہے۔ رہا کسی ملک یا کسی ایک بڑے علاقے میں سب مسلمانوں کی ایک عید ہونے کا مسئلہ تو شریعت نے اس کو بھی لازم نہیں کیا ہے۔ یہ اگر ہو سکے اور کسی ملک میں شرعی قواعد کے مطابق رویت کی شہادت اور اس کے اعلان کا انتظام کر دیا جائے تو اس کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ مگر شریعت کا یہ مطالبہ ہرگز نہیں ہے کہ ضرور ایسا ہی ہونا چاہیے اور نہ شریعت کی نگاہ میں یہ کوئی برائی ہے کہ مختلف علاقوں کی عید مختلف دنوں میں ہو۔

خدا کا دین تمام اِنسانوں کے لیے ہے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ آج آپ ریڈیو کی موجودگی کی بنا پر یہ باتیں کر رہے ہیں کہ سب کی عید ہونی چاہیے، مگر آج سے ساٹھ ستّر برس پہلے تک پورے برِّصغیر ہند تو درکنار، اس کے کسی ایک صوبے میں بھی یہ ممکن نہ تھا کہ ۲۹ رمضان کو عید کا چاند دیکھ لیے جانے کی اطلاع سب مسلمانوں تک پہنچ جاتی۔ اگر شریعت نے عید کی وحدت کو لازم کر دیا ہوتا تو پچھلی صدیوں میں مسلمان اِس

حکم پر آخر کیسے عمل کر سکتے تھے؟ پھر آج بھی اس کو لازم کر کے عید کی یہ وحدت قائم کرنا عملاً ممکن نہیں ہے۔ مسلمان صرف بڑے شہروں اور قصبوں ہی میں نہیں رہتے۔ دور دراز دیہات میں بھی رہتے ہیں اور بہت سے مسلمان جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی مقیم ہیں۔ وحدتِ عید کو ایک لازمی شرعی حکم بنانے کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان ہونے کے لیے ملک میں صرف ایک ریڈیو اسٹیشن کا ہونا ہی ضروری نہ ہو، بلکہ ہر شخص کے پاس یا ہر گھر کے لوگوں یا مسلمانوں کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بستی میں ایک ریڈیو سیٹ یا ایک ٹرانزسٹر بھی ضرور ہو، ورنہ وہ اپنے شرعی فرائض ادا نہ کر سکیں گے۔ کیا یہ آلات بھی اب دین کا ایک لازمی جزء قرار پائیں گے؟ خدا کی شریعت نے تو ایسے قواعد مقرر کیے ہیں جن سے ہر مسلمان کے لیے ہر حالت میں دینی فرائض ادا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اُس نے نماز کے اوقات گھڑیوں کے حساب سے مقرر نہیں کیے کہ گھڑی ہر مسلمان کے لیے اُس کے دین کا ایک جُز بن جائے، بلکہ اُس نے سورج کے طلوع و غروب اور زوال جیسے عالم گیر مناظر کو اوقاتِ نماز کی علامت قرار دیا، جنھیں ہر شخص ہر جگہ دیکھ سکتا ہے۔

اِسی طرح اُس نے روزے شروع اور ختم کرنے کے لیے بھی رمضان اور شوال کے چاند کی رویت کو علامت قرار دیا ہے جو عالم گیر مشاہدے کی چیز ہے اور ہر مسلمان ہر جگہ چاند دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ اب رمضان شروع ہوا اور اب ختم ہو گیا۔ اگر وہ اس کی بنیاد جنتری کے حساب کو قرار دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہر مسلمان کے لیے یا تو فلکیات اور نجوم کا علم حاصل کرنا فرض ہو جاتا، یا جنتری اُس کے دین کا ایک جز بن جاتی جسے پاس رکھے بغیر وہ فرائض دینی ادا نہ کر سکتا اور اگر وہ یہ حکم دیتا کہ ایک جگہ کی رویت سے ساری دنیا میں یا روئے زمین کی ایک ایک اقلیم میں روزے شروع اور ختم کرنا فرض ہے تو خبر رسانی کے موجودہ ذرائع کی ایجاد سے پہلے تو مسلمان اس دین پر عمل کر ہی نہیں سکتے تھے۔ رہا ان کی ایجاد کے بعد کا دَور تو اس میں بھی مسلمانوں پر یہ مصیبت نازل ہو جاتی کہ چاہے انھیں روٹی اور کپڑا میسّر نہ ہو، مگر وہ مسلمان رہنا چاہیں تو اُن کے پاس ایک ٹرانزسٹر ضرور ہو۔'' [تفہیمات، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، جلد چہارم، ص ۱۴۷-۱۵۰]

حواشی ومراجع

۱ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ج۲،ص۲۹۶

۲ الملخص الفقہی :۱/۲۶۲-۲۶۳

۳ المفہم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم، الامام الفقیہ ابوالعباس القرطبی۳/۱۴۱

۴ المنجد،ص۱۱۳۳

۵ رؤیت ہلال کا مسئلہ اور اس کا حل،شمس پیرزادہ،ص۹

۶ رؤیت ہلال،غازی عزیرص۳۰۶

۷ ابونعیم،ابن عساکر،بحوالہ تیسیر الرحمٰن ص:۱۰۵

۸ بحوالہ رؤیت ہلال غازی عزیر:ص۲۵۴

۹ احسن البیان:ص۵۶۲

۱۰ حوالہ بہ تصرف احسن البیان :ص۱۲۴۱

۱۱ بخاری:۱۸۰۸،مسلم:۱۰۸۰

۱۲ لسان العرب، ج۱۲ص۴۴۳

۱۳ بخاری،۱۸۱۴،مسلم۱۰۸۰

۱۴ بخاری،مسلم

۱۵ جامع الترمذی:۸۰۲،صححہ الالبانی

۱۶ مسلم۱۰۸۷،ابوداؤد۲۸۳۲،ترمذی۲۹۳،نسائی:۴/۱۳۱۔مسند احمد:۲۷۹۰

۱۷ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ،جنوری- مارچ ۱۹۹۲،ص۶۱

۱۸ الاسئلة والاجوبة الفقهية ... عبدالعزيز المحمد السليمان۔ ۱۳۶/۲

۱۹ العلم المنشور فی اثبات الشهور للسبکی، بحواله توحيد بداية الشهور القمريه للشيخ السايس، ص:۹۴۳

۲۰ فتاویٰ،۱۰۸/۲۵ ۲۱ شرح صحیح مسلم،۲۰۴/۲

۲۱الف المجموع مع شرح المهذب للنووی ۳۰۰/۶،شرح صحيح مسلم: ۲۰۴/۲

۲۲ عون المعبود، ۶/۴۵۵ ۲۳ جامع ترمذی:۶۹۳

۲۴ تحفة الأحوذی: ۲/۳۶ ۲۵ سنن النسائی، حاشیہ السندی، ۲/۱۳۱

۲۶ صحیح ابن خزیمہ، حدیث نمبر ۱۹۱۶، ۳/۲۰۵

۲۷ بحوالہ رؤیت ہلال، غازی عزیر، ص:۱۵۶

۲۸ شرح السنۃ، ۶/۲۴۵- ۲۴۶ ۲۹ تمام المنہ، ص: ۳۹۸

۳۰ مجموع الفتاوی علی هامش خلاصة الفتاوی ۱/۲۵۵-۲۵۶ بحوالہ جدید فقہی مسائل ص۸۲

۳۱ بداية المجتهد ۱/۲۸۷-۲۸۸ ۳۲ المغنی لابن قدامہ: ۳/۸۷

۳۳ **المجموع ۶/۳۰۰. المسائل الفقهية التی انفرد به الامام الشافعی من دون اخوانه من الأئمة. لابن كثير ص:۱۱۷**

۳۴ الاستذكار لابن عبد البر ۳۰/۱۰ ، الجامع لأحكام القرآن **۲۹۵/۲**

۳۵ مسلم ،بابُ لا اعتبارَ بكِبَرِ الهلالِ وصغرِهِ ،موسوعة فقه عبدالله بن عباس، د/رواس قلعجی ،ص۴۸۰

۳۶ سبل السلام :۱۵۱ ۳۷ سبل السلام: ص۱۵۶

۳۸ رؤیت ہلال کا مسئلہ اور اس کا حل، ص۱۳

۳۹ دلیل الطالبین شرح ریاض الصالحین، ۱/۱۳۷

۴۰ ابوداؤد ۲۳۲٤ ، ترمذی ۹٦۷ وصححه الالبانیؒ فی صحیح الترمذی ٥٦١ اللجنة الدائمة للبحوث والافتاء، ۹٤/۱۰ شیخ محمد صالح المنجد

۴۱ بحوالہ رمضان کے فضائل واحکام، ص۸-۹

۴۲ فتاوی علماء البلد الحرام للشیخ سعد بن عبداللہ البریک، ص:۲۳۱

۴۳ بخاری ۴۴ مسلم

۴۵ نسائی ۴۶ فتاویٰ ۲۵/۱۱۵

۴۷ تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسیر کلام المنان، ص:۷۰۰

☆☆☆

مولانا فتح محمد جالندھریؒ بہ حیثیت مترجمِ قرآن

جناب محمد سلیم اسماعیل

مولانا فتح محمد خان جالندھری کا تعلق ایک علمی، ادبی اور دینی گھرانے سے تھا۔ آپ کے آباء واجداد افغانستان سے ہندوستان آئے تھے اور آپ افغانی الاصل روہیلوں کے یوسف زئی قبیلے کے چشم و چراغ تھے۔ یہ وہ قبیلہ تھا جس کے بارے میں بہ قول حفیظ جالندھری، سید احمد شہیدؒ نے کہا تھا کہ ''اس خاندان میں انوار ولایت متوارث چلے آرہے ہیں''۔ آپ کے جدامجد جناب یار محمد خان فوجی افسر کی حثیت سے ہندوستان آئے، لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس صاحبِ شمشیر کی اولاد سے ایک صاحبِ قلم بھی پیدا ہوگا، جو پورے ہندستان میں آفتاب بن کر چمکے گا اور بے شمار لوگ اس کے علم وفضل سے مستفید ہوں گے۔[۱] آپ کے جدامجد یار محمد خان افغانستان سے ہجرت کر کے ہندستان آئے تو ریاست رام پور میں قیام کیا، وہیں ان کی شادی ہوئی، لیکن تلوار کے اضطراب نے انہیں رام پور سے پنجاب پہنچا دیا اور وہاں کے مشہور ومعروف ضلع جالندھر میں انھوں نے سکونت اختیار کی۔

مولانا فتح محمد خان جالندھری کی پیدائش گاؤں ٹانڈا ضلع ہوشیار پور میں ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء کو ہوئی۔ لیکن آپ کے والد محترم کی ملازمت چونکہ جالندھر میں تھی، اس لیے آپ کی پرورش جالندھر میں ہی ہوئی[۲]۔ مولانا فتح محمد کے ذاتی حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ اپریل ۱۹۲۸ء کو حفیظ جالندھری نے لاہور سے نکلنے والے علمی وادبی رسالہ 'مخزن' میں لکھا تھا: ''میں نے آپ کے حالات فراہم کرنے کی کوشش کی، لیکن مجھے ناکامی ہوئی، کیونکہ جالندھر میں بھی، جو میرا وطن ہے، بہت کم لوگ ہیں جو آپ کے ذاتی حالات سے کماحقہ واقف ہوں''۔[۳]

علمی وادبی خدمات

۱۹۳۸ء میں لاہور کے ایک بڑے پریس 'عطر چند اینڈ کپور سنز' نے اپنی گولڈن جوبلی کے موقع پر ایک خاص شمارے کا اہتمام کیا، جس میں ہندوستان کے تمام بڑے بڑے علماء وادباء، جن میں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی سب شامل تھے ان کو ان کی علمی ادبی خدمات پر خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اس میں مولانا فتح محمد جالندھری کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا:

> ''پریس نے مولانا فتح محمد جالندھری سے پرائمری، مڈل اور اعلیٰ درجات کے لیے اردو اور فارسی گرامر کی کتابیں تصنیف کرنے کی درخواست کی۔ وہ اپنی اعلیٰ صلاحیت کی بنا پر اس کام کے لیے بہت موزوں تھے۔ انھوں نے کافی محنت اور بہت وقت صرف کر کے ایسی کتابیں تصنیف کر دیں جو اس وقت ہندوستان کی معیاری کتابیں تھیں اور آج بھی انھیں اہم مقام حاصل ہے''۔[۴]

مولانا جالندھری کی اردو زبان میں مہارت کا ثبوت ہمیں ان کی تصنیف کردہ ان کتب سے ملتا ہے جو پرائمری، مڈل، ہائی اور اعلیٰ تعلیمی نصابات میں شامل تھیں۔ ان کی ایک کتاب 'مبادی القواعد' (اردو قواعد کا ابتدائی رسالہ) تھی، جسے محکمۂ تعلیم پنجاب نے اَپر پرائمری جماعتوں کے لیے ٹیکسٹ بک مقرر کیا۔ یہ کتاب رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز سے شائع ہوئی۔[۵] مولانا کی ایک دوسری کتاب 'افضل القواعد' کے نام سے شائع ہوئی، جو اردو گرائمر پر مشتمل تھی اور اسے بھی پرائمری جماعتوں کے نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔ اس پر مولانا ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب کے ممبران کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں: ''یہ میرے لیے خوشی اور عزت کا موجب ہے کہ ممبران ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب نے ازاراہ قدردانی کتاب ونفع رسائی طُلّاب جناب ڈائریکٹر صاحب سررشتۂ تعلیم کی خدمت میں اس کے داخل درس کیے جانے کے لیے سفارش کی اور صاحب موصوف

نے اسے ٹیکسٹ بک مقرر فرمایا۔ میں ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں‘‘۔[۶]

تیسری کتاب مصباح القواعد کے نام سے ہے۔ اسے لکھ کر مولانا جالندھری نے نہ صرف اردو دان طبقہ کی، بلکہ عربی اور فارسی سمجھنے والوں کے لیے بھی بہت بڑی خدمت سرانجام دی۔اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۲۵/اگست ۱۹۲۳ءکو انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں طے ہوا کہ اردو قواعد پر ایک مکمل اور بسیط کتاب تیار کروائی جائے اور اس کام کے لئے شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد، مولوی حیدر علی طبا طبائی،مولوی عبدالحلیم شرر وغیرہ سے مشورہ کیا گیا۔ ان کی باہمی مشاورت سے مولانا جالندھری کی کتاب ’مصباح القواعد‘ اس مقصد کی تکمیل کے لئے تجویز کی گئی۔[۷]اس کتاب پر جن لوگوں نے تعریفی وتوصیفی کلمات کہے ان میں شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد ،مولوی علی حیدر طباطبائی ،مولوی عبدالمغنی ،رائے بہادر، لالہ پیارے لال، سر محمد اقبال ،مولوی ذکاء اللہ، خلیفہ عماد الدین ،لالہ شیولال وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ چوتھی کتاب ’منہاج القواعد‘ کے نام سے مولانا جالندھری نے لکھی جو پنجاب یونیورسٹی کے حکم سے انٹرنس کے نصاب تعلیم میں شامل تھی ۔ یہ کتاب عطر چند کپور اینڈ سنز نے لاہور سے ۱۹۱۹ء میں شائع کی[۸]اس سے بہ خوبی واضح ہوجاتا ہے کہ فن قواعد اور زبان دانی میں مولانا جالندھری کا رتبہ بہت بلند تھا۔ اردو زبان میں دینیات کے موضوع پر مولانا کی تصنیف کردہ دیگر کتب میں الوردوالریحان ، الیاقوت والمرجان، نفیس تحفہ، طریق الاملاء، نفائس القصص والحکایات، ارشادات القرآن اور الاسلام قابل ذکر ہیں۔[۹]

ترجمۂ قرآن

مولانا فتح محمد خان جالندھری کی سب سے اہم خدمت ان کا ترجمۂ قرآن ہے، جو بہ عنوان ’نور ہدایت‘ بغیر عربی متن کے اور ’فتح الحمید‘ عربی متن کے ساتھ برصغیر پاک و ہند میں بہت مشہور ہوا۔ یہ ترجمۂ قرآن پہلی بار غالباً ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں امرتسر سے، اس کے بعد ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں رفاہ عام پریس لاہور سے شائع ہوا۔[۱۰]

مولانا اپنے ترجمۂ قرآن کے بارے میں رقم طراز ہیں۔ ''اس ترجمے میں جس امر کی زیادہ تر کوشش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ سہل، سلیس اور بامحاورہ ہو، اور اس کے ساتھ مطالب قرآنی صحیح ادا ہوں، نیز الفاظ و معانی میں مناسبت اور مطابقت تام ہو''۔[۱۱]

مولانا جالندھری اپنے ترجمۂ قرآن کی خوبیاں درج ذیل اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں:

ہیں قرآن میں خوبیاں جمع اتنی — زباں کو بیان کی نہیں جن کے طاقت
مضامین ہیں عرش اعظم سے اترے — اتاری فرشتوں نے ایک ایک آیت
فصاحت کا سرمایۂ ناز ہے وہ — ہوئی جاتی ہے اس پہ صدقے بلاغت
یہ از بس کہ ہے ترجمہ بھی اسی کا — ہے اس میں بھی برکت سے اس کی سلاست
نہیں رائے کو دخل اس میں دیا کچھ — کہ ہے یہ سرا سر خلافِ دیانت
جو رکھتے ہیں اللہ سے خوف ان کو — خلافِ دیانت سے ہے سخت نفرت
زبان و قلم پر وہی بات آئی — جو فرما گئے اہل عہد نبوت
یہی سمجھا جو سمجھے تھے اہل قرآن — وہی لکھا جو لکھتے ہیں اہل سنت[۱۲]

مولانا فتح محمد جالندھری نے یہ ترجمۂ قرآن عوامی ذہن کے مطابق سلیس آسان اور عام فہم اردو زبان میں کیا ہے۔ انھوں نے اردو میں ہندی اور سنسکرت کے مستعمل الفاظ کی بجائے عربی و فارسی کے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ترجمۂ قرآن اپنے دور سے لے کر آج تک مسلسل مشہور ترین ترجمۂ قرآن سمجھا جاتا رہا ہے۔

اہل علم کے تاثرات اور تبصرے

فتح الحمید کا منظر عام پر آنا تھا کہ برصغیر پاک و ہند کے مشرق و مغرب سے جید علماء کے تحسینی و توصیفی کلمات مولانا کو وصول ہونے شروع ہو گئے۔ کئی علمی و ادبی اخبارات و جرائد نے بھی اس کی علمی افادیت کا تذکرہ کیا:

مولانا سید شاہ محمد بدرالدین امیر شریعت صوبۂ بہار نے مولانا کے نام اپنے

ایک خط میں اس ترجمۂ قرآن بارے میں لکھا: ''کئی سال ہوئے کہ جب سے تقریراً یا تحریراً جس کسی نے مجھ سے پوچھا کہ رائج اردو تراجم کلام اللہ میں کون سا ترجمہ اچھا ہے؟ کس کا ترجمہ منگواؤں؟ تو میں نے جواب میں یہی کہا کہ 'فتح الحمید' نام کا ترجمہ سبھوں میں بہترین ہے''۔[۱۳]

مزید فرماتے ہیں:

> ''میں نے فتح الحمید کا ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ترجمۂ قرآن کے ساتھ تقابل کیا۔ ڈپٹی صاحب کے ترجمے میں ہلالی خطوط کے درمیان ضرورت سے زیادہ الفاظ پائے، جب کہ مولانا جالندھری کے ترجمہ کو ان عیوب سے پاک پایا۔ اس بنا پر میں آپ کے ترجمے کو اصح التراجم اور بہترین ترجمہ جانتا ہوں''۔[۱۴]

مولوی سید ممتاز علی، جو دارالاشاعت پنجاب لاہور کے مالک تھے، انہوں نے مولانا کا ترجمۂ قرآن پڑھا تو پھڑک اٹھے اور برملا کہا: ''جتنے ترجمے اس وقت شائع ہوئے وہ سب ہماری نظر سے گزرے ہیں، مگر جس ترجمے کو ہم نے زیادہ پسند کیا اور جس میں فی الواقع سب سے بڑھ کر خوبیاں ہیں، وہ فتح الحمید ہے، ایسے ترجمے کی مسلمانوں کو اشد ضرورت تھی۔ زبان کی نفاست وسلاست اور متانت، جو اس ترجمے میں ہے، وہ اوروں میں نہیں۔ آسان ایسا کہ بچے اور عورتیں بھی مطالبِ قرآنی سہولت سے سمجھ سکتے ہیں۔ بامحاورہ ایسا کہ پڑھنے والا بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ کسی فصیح اللسان دہلی نژاد کا کیا ہوا ہے"۔[۱۵]

مولانا عبداللہ عمادی اس ترجمۂ قرآن کے بارے میں فرماتے ہیں: ''ہماری رائے میں یہ ترجمہ مختصر اور مطلب خیز ہے''۔[۱۶]

زاہد ملک نے اپنی کتاب 'مضامین قرآن' میں مولانا کے ترجمۂ قرآن کے خصائص کا ذکر کرتے ہوئے اسے تمام مسائل کے لئے قابلِ قبول، سلیس، عام فہم اور جمہور تفاسیر کے مطابق قرار دیا ہے۔[۱۷]

ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین نے مولانا جالندھری کے مذکورہ ترجمۂ قرآن کے بارے میں لکھا ہے: ''ترجمہ فتح الحمید میں ان کا اسلوب نہایت سلیس، سادہ اور عام فہم ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ ترجمہ عوام میں بہت مقبول ہوا۔ ان کے ترجمے میں مشکل پسندی قطعاً نہیں ہے۔ آسان ترین الفاظ اور بندشوں کا استعمال کیا ہے۔ یہ ترجمہ لکھ کر مولوی فتح محمد نے واقعی عوام کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس میں انہوں نے عالمانہ اسلوب اور دقت پسندی کو بالکل خیر باد کہہ دیا ہے۔ ہر بات کو سیدھے، بلاواسطہ اور بغیر ہیر پھیر کے بیان کر دیا ہے''۔[۱۸]

رسالہ انجمن حمایت اسلام لاہور نے اس ترجمۂ قرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''قرآن مجید کا سب سے آخری ترجمہ جس پر ملک کے تمام انگریزی اور اردو اخبارات کے ذریعے اہل ملک اور اچھے اچھے عربی زبان سے واقف نقاد مبصروں کی طرف سے بے حد پسندیدگی کا اظہار ہو رہا ہے وہ مولوی فتح محمد جالندھری کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بامحاورہ ہے۔ اس میں لفظی ترجمے کی رعایت کا بھی حتی الوسع التزام کیا گیا ہے۔ زبان ایسی پاک اور شستہ جیسی کہ اس مقدس کلام کی شان کے لئے ضروری تھی۔ آیتوں کی ترتیب ایسی اچھی ہے کہ ہر آیت کے ساتھ نمبر دے کر اس کے ترجمے کے ساتھ بھی نیچے وہی نمبر دیا گیا ہے۔[۱۹]

اس ترجمے کے بامحاورہ اور فصیح ہونے کے علاوہ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ معتبر تفاسیر اور مسلمہ اصولوں کے مطابق قرآن کریم کے معانی کو ادا کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر مفید حواشی بھی درج ہیں، جو کتب صحاح اور مستند تفسیروں سے اخذ کیے گئے ہیں۔

حضرت خواجہ حسن نظامی نے اس ترجمۂ قرآن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے: ''جناب مولوی فتح محمد خان صاحب جالندھری کا ترجمۂ قرآن مجید میں نے پڑھا۔ یہ ترجمہ مزے دار اردو میں ہے، یعنی جس زبان میں چٹخارے نہ ہوں۔ نہایت سنجیدہ، شائستہ اور عام فہم صاف سلیس زبان میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفہوم قرآنی کو اردو

کے بہت سے تراجم کے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح ادا کرتا ہے۔ جو لوگ زبان کے چٹخارے کو پیش نظر رکھتے ہیں وہ بعض اوقات ایسی غلطی کر جاتے ہیں کہ منشائے قرآنی بدل جاتا ہے اور قرآن کا سنجیدہ لہجہ عامیانہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بہت بڑا عیب ہے۔ قرآن مجید کی شان و متانت ترجمے میں باقی رکھنی چاہیے جو اس ترجمے میں موجود ہے۔ جہاں تک متن قرآنی کی شان اردو ترجمے میں آ سکتی ہے۔ مترجم نے کوشش کی ہے کہ اردو کے صحیح محاوروں میں اس کو ادا کرے۔ خطوط وحدانی کا بہت کم استعمال کیا ہے ان اعتبارات سے اس ترجمے کو بہت پسند کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ مسلمان اس کو پڑھیں اور اپنی عورتوں اور بچوں کو پڑھائیں''۔[۲۰]

مولوی محمد حلیم انصاری نے اس ترجمۂ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا:

''مولوی صاحب نے قرآن مجید کا اردو میں ایسا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کیا ہے جو اپنی سلاست و متانت اور لطافت کے لحاظ سے بالکل اچھوتا ہے اور الفاظ وحشیہ ولغات متنافرہ سے بالکل پاک ہے''۔[۲۱]

مولانا احسان اللہ خان نجیب آبادی فاضل دیو بند نے اس ترجمۂ قرآن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ''جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اس وقت دو ترجمے رائج ہیں: ایک ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کا اور دوسرا مولوی فتح محمد خان جالندھری کا، جو فتح الحمید کے نام سے موسوم ہے:[۲۲]

مولانا فتح محمد جالندھری اپنے ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں خود لکھتے ہیں:

''میرے دل میں تو کبھی یہ خیال نہیں پیدا ہوا تھا کہ قرآن مجید کا بالا ستیعاب ترجمہ کر دوں، مگر چونکہ یہ سعادت میری قسمت میں لکھی تھی، اس لیے ارشادات القرآن اور نفائس القصص والحکایات کا شائع ہونا تھا کہ سخن شناسان اہل ذوق نے تمام قرآن کا ترجمہ کر دینے کے لئے فرمائش کر دی۔..... اگر یہ معتبر تفاسیر سے جانچا جائے گا تو کسوٹی پر کسا ہوا سونا نظر آئے گا''۔[۲۳]

ایک دفعہ تاج کمپنی نے ایک نہایت دیدہ زیب رنگین عکسی قرآن مجید کی

اشاعت کی تجویز پیش کی، تو ضروری سمجھا کہ اس کی طباعت کے حسن صوری کے دوش بدوش حسن معنوی بھی پیدا کیا جائے، مگر آخر کار ایک مجلس شوری قائم کی گئی جس میں حضرت مولانا داؤد غزنوی (امرتسری) حضرت مولانا احمد علی صدر انجمن خدام الدین لاہور، حضرت مولانا غلام مرشد صاحب بھائی دروازہ لاہور، اور دیگر معزز علمائے کرام کو دعوت مشورہ دی گئی۔..... چنانچہ تبادلۂ خیالات اور غور وفکر سے قرار پایا کہ کوئی اعلی پائے کا موجود ترجمہ شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ نظرِ انتخاب اس مقبول ومعروف اردو ترجمہ پر ٹھہری جو حضرت مولانا فتح محمد خان مرحوم جالندھری کی طرف منسوب اور "فتح الحمید کے نام سے موسوم ہے۔[۲۴]

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ، صدر جمعیت العلماء ہند دہلی نے مولانا جالندھری کے ترجمۂ قرآن کا مطالعہ کیا، پھر بذریعہ خط انہیں لکھا: ''خاکسار نے تاج کمپنی لمیٹیڈ لاہور کی خواہش پر مولانا فتح محمد جالندھری مرحوم کے ترجمۂ قرآن، جو فتح الحمید کے نام سے معروف ہے، کا مطالعہ کیا۔ تمام قرآن مجید کا ترجمہ تو میں دیکھ نہ سکا، مگر چند مقامات کو بغور دیکھنے کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ترجمہ بھروسے اور اعتماد کے قابل ہے۔ قابل مترجم نے قرآن مجید کا مفہوم ادا کرنے میں سلف صالحین کے مسلک کا اتباع کیا ہے اور ترجمہ کو با محاورہ، مطلب خیز، عام فہم بنانے کے باوجود الفاظ قرآنیہ کی پوری رعایت رکھی ہے اور توضیحات تفسیریہ کی غرض سے بین القوسین عبارتیں بڑھانے سے حتی الامکان اجتناب کیا ہے۔ الغرض یہ ترجمہ اپنے محاسن کے لحاظ سے ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے'':[۲۵]

حضرت مولانا احمد علی، ناظم انجمن خدام الدین لاہور نے اپنے ایک خط میں مولانا کے ترجمۂ قرآن کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ''حضرت مولانا فتح محمد خان مرحوم و مغفور کا ترجمۂ قرآن مجید مسمی فتح الحمید میں نے مقامات عدیدہ سے دیکھا اور کئی جگہ سے حواشی کا مطالعہ بھی کیا۔ جس سلیس اور عام فہم زبان میں مولانا ممدوح نے ترجمہ کیا ہے، دل ان کی محنت اور عرق ریزی کی بے ساختہ داد دیتا ہے۔ ترجمہ با محاورہ اور حشو و زواید

سے بالکل بری ہے۔ باوجود اس کے ایسا معنی خیز ہے کہ معمولی استعداد کا انسان بہ آسانی مرادِ الٰہی سمجھ سکتا ہے۔ کوئی بات اس میں ایسی نظر نہیں آتی جو سید المرسلین خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت یا قرونِ اولیٰ کے خلاف ہو۔ میرے خیال میں اردو داں مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ غیر مستند اشخاص کے انگریزی ترجموں کے بجائے "فتح الحمید کا مطالعہ کریں"۔[۲۶]

پروفیسر ڈاکٹر محمد نسیم عثمانی مولانا کے ترجمۂ قرآن کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں: ''ان کا ترجمۂ قرآن مجید با محاورہ ہونے کے ساتھ ساتھ مستند اور مفید سمجھا جاتا ہے اور امت مسلمہ کے تمام فرقوں کے لئے قابل قبول ہے''۔[۲۷]

فتح الحمید کا تنقیدی جائزہ

مولانا فتح محمد جالندھری نے فتح الحمید میں تفسیری ترجمۂ قرآن کیا، جو کہ لفظی ترجمۂ قرآن سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اس میں اردو زبان کی تراکیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور بڑے شان دار انداز میں اصلی عربی متن سے زیادہ دور گئے بغیر قرآنی آیات کے مفہوم کو ادا کیا گیا ہے۔ اردو قارئین کی سہولت کے لئے کہیں کہیں بعض قرآنی الفاظ کی تشریح بین القوسین زائد الفاظ سے بھی کی گئی ہے۔ بعض جگہوں پر جہاں کسی بلاغی پہلو کی تشریح ناگزیر تھی، وہاں کم از کم اشارے سے مفہوم سمجھانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

اس ترجمۂ قرآن کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ہندی اور سنسکرت الفاظ کی بجائے اردو زبان میں مستعمل عربی و فارسی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ ترجمۂ قرآن تقریباً سو سال گزرنے کے بعد بھی آج تروتازہ دکھائی دیتا ہے۔ قرآن پاک کی بعض اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کے بجائے انہیں اسی طرح عربی میں ہی رہنے دیا گیا ہے۔ البتہ جہاں ابہام کا ڈر ہوا وہاں اس کی توضیح کر دی گئی ہے۔ اس ترجمۂ قرآن کے حاشیہ میں بعض اہم مسائل سے مستند و مدلل بحث بھی کی گئی ہے، جو قارئین کی دلچسپی کا

موجب ہے۔ مولانا نے قرآن کریم کی بعض آیات کے مفہوم کو بیان کرنے کے لئے اسباب النزول کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس ترجمۂ قرآن میں ترجمہ کے بعض اصولوں کی سختی سے پیروی کی گئی ہے۔ اس کی شہرت کی بڑی وجہ اس کا معتبر تفاسیر سے ماخوذ ہونا ہے۔ مولانا نے جمہور تفاسیر سے استفادہ کیا ہے اور شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے تراجم قرآنی کو سامنے رکھا ہے۔

اس ترجمہ میں سہولت کے پیش نظر اردو ترجمہ میں بھی آیتوں کے نمبر درج کردیے گئے ہیں۔ اس میں ایک خاص بات کا اہتمام یہ بھی کیا گیا ہے کہ ترجمہ میں زائد الفاظ نہ آنے پائیں۔ اس میں مولانا نے بعض ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جو پہلے اردو میں مستعمل نہیں تھے، لیکن عربی و فارسی دان طبقے کے ہاں مانوس تھے۔ مولانا نے ترجمہ میں بعض مقامات پر کچھ جدت پسندی کا اظہار بھی کیا ہے مثلاً قرآن کریم کے لفظ ''بقرۃ'' کا ترجمہ بجائے 'گائے' کے 'بیل' کیا ہے۔

اس ترجمۂ قرآن میں بعض کوتاہیاں بھی سرزد ہوئی ہیں، جو قابلِ درگزر تو ہیں، لیکن انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً مولانا نے ہر جگہ اسم الجلالہ (اللہ) کا ترجمہ 'رب' سے کیا ہے، جو کہ اللہ تعالی کی الوہیت کے تمام معانی کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح سورۂ فیل میں ''طیراً ابابیل'' کا ترجمہ 'جھلڑ کے جھلڑ جانور' کیا ہے، جو ترجمہ 'جھنڈ کے جھنڈ پرندے' سے بہتر نہیں ہے۔ ایک تو 'طیراً' کا ترجمہ جانور کیا، جب کہ دیگر اکثر مترجمین نے 'پرندے' یا 'چرند پرند' کیا ہے، دوسرے 'ابابیل' کا ترجمہ 'جھلڑ کے جھلڑ' کیا ہے۔ اس کے بجائے 'جھنڈ کے جھنڈ' زیادہ سلیس اور عام فہم معلوم ہوتا ہے۔

بعض مقامات پر فارسی کے مشکل الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے مثلاً ''خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا'' (البیّنۃ:۸) کا ترجمہ 'وہ ابدالآباد ان میں بسیں گے' کے الفاظ سے کیا ہے، جب کہ شاہ عبدالقادر نے اس کا ترجمہ 'سدا رہیں ان میں ہمیشہ' کیا ہے، جو زیادہ بہتر اور آسان لگتا ہے۔

حواشی ومراجع

۱ ظہور الدین پبلشرز مخزن، لاہور، ج:۲،ص:۶، مقالہ نگار: حفیظ جالندھری، عنوان: 'مولوی فتح محمد جالندھری'، گیلانی الیکٹرک پریس، ۱۹۴۸ء

۲ سنیہ خانم سے حاصل ہونے والی بہ راہ راست معلومات (سنیہ خانم مولانا فتح محمد خان جالندھری کے بڑے صاحب زادے نذیر احمد خان کی صاحب زادی ہیں، جو مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد میں رہائش پذیر ہیں)

۳ مقالہ 'مولوی فتح محمد جالندھری'، از حفیظ جالندھری، ص:۶

۴ Uttar Chand Kapur and Sons: House of Kapur's Golden Joblee, 1983, P18

۵ جالندھری، فتح محمد خان، مبادی القواعد، منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور، ۱۹۱۹ء، سرورق

۶ جالندھری، فتح محمد خان، افضل القواعد، لاہور، سرورق

۷ جالندھری، فتح محمد خان، مصباح القواعد، ناظم برقی پریس لاہور، ۱۹۱۹ء، سرورق

۸ جالندھری، فتح محمد خان، منہاج القواعد، عطر چند اینڈ کپور سنز لاہور، ۱۹۱۳ء، سرورق

۹ ملاحظہ کیجیے مذکورہ کتابوں کے سرورق

۱۰ صالحہ عبدالحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اردو تراجم، طبع کراچی، ص۲۶۲

۱۱ جالندھری، فتح محمد خان، فتح الحمید، قرآن مجید ترجمۂ جدید، تاج کمپنی لاہور، ۱۳۵۴ھ، دیباچہ

۱۲ حوالہ بالا ۱۳ حوالہ بالا

۱۴ حوالہ بالا ۱۵ حوالہ بالا

۱۶ حوالہ بالا

۱۷ زاہد ملک، مضامین قرآن، العمر پرنٹرز، مطبوعاتِ حرمت، اسلام آباد، ۱۹۷۸ء، ص۵۲

۱۸ صالحہ عبدالحکیم شرف الدین، قرآن حکیم کے اردو تراجم، ص۲۶۲

۱۹ جالندھری، فتح محمد خان، فتح الحمید، لاہور، دیباچہ

۲۰ حوالہ بالا ۲۱ حوالہ بالا

۲۲ حوالہ بالا ۲۳ حوالہ بالا

۲۴ حوالہ بالا ۲۵ حوالہ بالا

۲۶ حوالہ بالا

۲۷ محمد عثمانی، ڈاکٹر، اردو میں تفسیری ادب پر ایک تاریخی تجزیاتی جائزہ، عثمانیہ اکیڈمک ٹرسٹ کراچی، سنہ طباعت درج نہیں، ص۹۳

معرکۂ اسلام و جاہلیت

مولانا صدرالدین اصلاحی

اسلام کی بصیرت افروز آگہی کے لیے جاہلیت سے واقفیت ناگزیر ہے۔

☆ عقائد، عبادت، اخلاقیات اور زندگی کے تمام معاملات میں جاہلیت اور اسلام کے درمیان اصولی فرق کیا ہے؟

☆ دونوں کے درمیان فطری اور مسلسل کش مکش کا انداز کیا ہے؟

☆ جاہل عناصر کس طرح اسلامی تصورات میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں؟

ان اہم پہلوؤں پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مصنف کے گہر بار قلم نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ صفحات: ۲۱۶ قیمت: -/۹۰ روپئے

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر اسرار احمد خان نے انتہائی معاری اور دلکش اسلوب میں Islamic Civilization in its Real Prespective کے نام سے کیا ہے۔

آفسیٹ کی عمدہ طباعت صفحات: ۱۳۷ قیمت: -/۹۰ روپئے

ملنے کے پتے : ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر-۹۳، علی گڑھ-۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

نواب صدیق حسن خاںؒ کی کتاب الحطّہ
ایک معروضی مطالعہ

مولانا جاوید احسن فلاحی

نواب صدیق حسن خاں قنّوجی کا شمار تاریخ کی اُن برگزیدہ اور چیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے کہ چشم فلک نے ان جیسے کم ہی دیکھے ہوں گے۔ علم وحکمت، مال و دولت، جرأت وشجاعت اور امارت وحکومت غرض دینی اور دنیاوی نعمتوں میں سے کون سی نعمت ہے جسے خالقِ کائنات نے انھیں بہ قدر وافر عنایت نہ فرمایا ہو۔ ان کی سیرت کا مطالعہ کرنے والا یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ ایک اکیلے شخص کے لیے اتنی ساری فتوحات اور کامیابیاں کیسے ممکن ہوسکیں کہ اگر ایک طرف وہ دوسو سے زائد اہم علمی رسائل وکتب کے مصنف ہیں جو گوں ناگوں اور متنوع موضوعات پر مشتمل ہیں تو دوسری طرف وہ اِمارت و حکومت میں ایسی شان رکھتے ہیں کہ ان کے حسنِ انتظام کے جلوے رعایا ہر طرف محسوس کرتی تھی اور تیسری طرف انھیں حاسدوں اور کم سوادوں سے ایک ایسی چومکھی جنگ لڑنی پڑی جس کے ساتھ علم وقلم کا رشتہ نباہنا دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ چنانچہ عقل یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتی کہ مالک حقیقی کا اُن کے ساتھ خاص کرم رہا کہ جس نے نہ صرف اُن کے سر پر علم و حکمت کا تاج رکھا، بلکہ خطّۂ ہند میں کشور بھوپال کی تاج داری وفرماں روائی بھی عطا کی۔[۱]

نواب صاحب کا علمی کارنامہ ایک بحرِ بے پایاں کے مانند ہے، جس کی وسعت و ہمہ گیری کا اندازہ کرنا بہت دشوار ہے۔ میں نے اس مضمون میں اس سمندر کے ایک درِّ نایاب کا انتخاب کیا ہے تاکہ بہ قدرِ امکان اس کی تابانی اور چمک دکھاسکوں، میری مراد نواب صدیق صاحب کی ایک قیمتی اور نایاب کتاب 'کتاب الحطّہ فی ذکر

الصحاح الستّة‘ سے ہے۔عربی زبان میں لکھی ہوئی یہ کتاب فنِ حدیث اوراس سے متعلق علوم پر مشتمل ہے اور صحاح ستہ کے علاوہ موطا امام مالک اور مسند احمد بن حنبل کے سلسلہ میں اہم اور وقیع معلومات کی دستاویز ہے۔ ہمارے پیش نظر اس کتاب کا دارالکتب العلمیۃ بیروت لبنان سے چھپا ہوا ۱۹۸۵ء مطابق ۱۴۰۵ھ کا ایڈیشن ہے۔اس کے مطالعہ سے اس بات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس فن میں ولی اللّٰہی مکتبِ فکر کے صحیح نمائندے تھے۔اس لیے اس مشکل فن کو انھوں نے اپنی خداداد ذہنی اور علمی صلاحیت سے طالبانِ فن کے لیے پانی کر دیا۔

مقصدِ تالیف

اس کتاب کا مقصد تالیف کیا ہے؟ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے نواب صاحب کتاب کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

’’جب اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں کتب ستّہ کی تحصیل سے فارغ ہوا تو میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس فن میں مستقل طور پر ایک ایسی تالیف ہونی چاہیے جو ان کتابوں کی خصوصیات اور ان کے سلسلہ میں ضروری معلومات پر مشتمل ہو، تاکہ حدیث و سنّت کے طالب علم کو تمام معلومات ایک جگہ مل جائیں اس سلسلہ میں جب میں نے چھان بین کی تو مجھے ایک بھی مصنف کی کسی ایسی کتاب کا پتہ نہ چلا جو طالب علم کی اس ضرورت کو پوری کر رہی ہو، اگرچہ الگ الگ کتابوں میں متعلقہ مواد موجود تھا۔ چنانچہ میرے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ میں خود ہی اس ضرورت کی تکمیل کا بیڑا اٹھاؤں اور وہ تمام معلومات ایک کتاب میں جمع کر دوں جن کا جاننا کتب ستہ کے مبتدی کے لیے بھی ضروری ہو اور منتہی کے لیے بھی اس سے مفر نہ ہو‘‘۔[۲]

آگے لکھتے ہیں:

’’میں نے اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا اور اس کے فضل سے چند دنوں میں یہ کتاب لکھ ڈالی۔اس سلسلہ میں اس موضوع سے متعلق میں نے تمام چھوٹی

بڑی کتابوں کا مطالعہ کیا اور سمندر کا سمندر کھنگال ڈالا اور بعد تلاش بسیار علم کے یہ بے بہا موتی ہم نے عزیز طلباء اور اہل علم کی خدمت میں پیش کیے، تاکہ اہل علم اس موضوع کی عظیم الشان کتابوں سے بے نیاز ہوسکیں اور اس سے فائدہ اٹھاسکیں، بالخصوص ہمارے صاحب زادے سیّد نورالحسن طیّب اس سے فائدہ اٹھائیں اور اسے حرز جان بنائیں''۔[۳]

زمانۂ تالیف

نواب صاحب نے یہ کتاب کب لکھی؟ اس کا تذکرہ کہیں نہ مل سکا، البتہ ڈاکٹر رضیہ حامد کی ایک عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۶۸ء مطابق ۱۲۸۵ھ، یعنی نواب صاحب کے سفرِ حج سے قبل لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحبہ نواب صاحب کے سفرِ حج سے متعلق باب میں لکھتی ہیں:

''۱۷/ رمضان کو جہاز عدن پہنچا اور دس دن بعد ۲۶/ رمضان کو حدیدہ میں داخل ہوا۔ یہاں آپ نے بارہ روز قیام کیا اور قاضی شیخ حسین بن محسن انصاری کے مکان پر فروکش ہوئے۔ بیس پچیس رسالے اپنے قلم سے نقل کیے۔ یہیں عیدالفطر کی نماز پڑھی، اپنی مولفہ کتاب 'الحطّۃ فی ذکر الصحاح الستّۃ' یہاں کے علماء کی خدمت میں ہدیۃً پیش کی اور چار کتابیں اقتضاء الصراط المستقیم، ارشاد الفحول، نیل الاوطار اور فتح القدیر خریدیں''۔[۴]

اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نواب صاحب نے اسے بتّیس تینتیس سال کی عمر میں لکھا ہے اور غالباً (۶۶-۱۸۶۵ء) کے درمیان یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ کتاب کے مندرجات کو دیکھ کر اس کے نوعمر مصنف کی عبقری صلاحیتوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کتاب کے مشتملات

پوری کتاب ایک مقدمہ اور پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ آخر میں ایک خاتمہ بھی ہے، جس میں مصنف نے اپنی زندگی کے مختصر حالات درج کیے ہیں اور کن علماء سے کیا کیا پڑھا اس کی تفصیل بھی دی ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ طلبِ علم اور مسائلِ حیات کو حل

کرنے کے لیے انھیں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چونکہ اس کا تعلق ان کے سوانح نگاروں سے ہے، اس لیے اس تفصیل کو قلم انداز کیا جاتا ہے:

کتاب کا مقدمہ تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں متعدد اہم علمی نکات پر بحث کی گئی ہے اور انھیں قرآن وسنت کے دلائل سے ثابت کیا گیا ہے ان میں سے بعض مباحث یہ ہیں۔ علم کی اہمیت، علم کیا ہے؟ اس کے مادّی اور روحانی کیا فوائد ہیں؟ علم کیوں حاصل کرنا چاہیے؟ تحصیل علم کی کیا شرائط ہیں؟ علم کے مراتب و مدارج کیا ہیں؟ یعنی علم کے حصول کا آغاز کہاں سے ہوا اور طالب علم کس طرح درجہ بدرجہ آگے بڑھے؟ طالب علم کے لیے سفر کی ضرورت اور اس کے فوائد، طلب علم میں حافظہ کی کیا اہمیت ہے اور استخراج واستنباطِ مسائل کی قوت کا کیا رتبہ ہے؟ تعلیم وتعلّم کے اہداف کیا ہوتے ہیں اور انھیں کیا ہونے چاہئیں؟ علم کی وسعت و جامعیت، اسلام سے پہلے علم کی حالت اور اسلام نے اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ مسلمانوں میں سب سے پہلا مصنف کون ہے؟ اور سب سے پہلے کس موضوع پر قلم اٹھایا گیا؟ علوم شرعیہ کی قسمیں، تصنیف اور مصنّف کی خصوصیات، علم کے تفرّعات وغیرہ۔

دوسری فصل میں علم حدیث کی اہمیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں نہ صرف حدیث اور علم حدیث کو شریعت کی شاہ کلید اور علم یقینی کی اساس اور بنیاد بتایا گیا ہے، بلکہ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ طالب علم کی علمی بصیرت اور مہارت کا معیار حدیث اور علوم حدیث ہیں اور اس علم میں جس کو جتنی مہارت ہو اہل علم میں اس کی اتنی ہی قدر و قیمت ہونی چاہیے۔ اس سلسلہ میں ایک نکتہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حدیث اور علم حدیث سے دشمنی صرف بدعتی ہی کو ہوسکتی ہے، کیوں کہ احادیث ہی بدعتی کی راہ کا سب سے بڑا روڑا ہیں۔ اس فصل کے اہم نکات یہ ہیں: علم حدیث کی فضیلت، اسناد کی اہمیت، دین میں علم اسناد کا مقام و مرتبہ وغیرہ۔ اس فصل میں علوم حدیث کے متعلقات کے ساتھ نواب صاحب کی شعر وادب کے ساتھ رغبت اور ان کی دلچسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریریں محض زاہد خشک کا وعظ اور محض جامد مذہبی افکار کا مجموعہ نہیں ہیں، بلکہ شعر وادب

کا ذوق اور اپنی بات کہنے کا سلیقہ بھی انھیں خوب آتا ہے۔ چنانچہ یہ پوری فصل اشعار پر مشتمل ہے۔ اس سے نواب صاحب کے حافظہ کا کمال بھی ظاہر ہوتا ہے۔ میرے خیال میں حدیث اور اہل حدیث پر یکجا اتنا بڑا شعری ذخیرہ اس کتاب کے سوا شاید کہیں نہ ہو۔

مقدمہ کے بعد اصل موضوع شروع ہوتا ہے جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ پانچوں ابواب کتاب کے دوسو سات صفحات پر مشتمل ہیں۔

پہلے باب میں علوم حدیث کی معرفت، اس کی جمع و تدوین اور نقول تیار کرنے سے متعلق ہے۔ اس میں پانچ فصلیں ہیں۔ پہلی فصل کا عنوان ہے علوم حدیث کی معرفت۔ اس کے تحت درج ذیل مباحث ملتے ہیں: علم حدیث کا تعارف، اس کا مقصد، اس کا موضوع، حدیث کے اجزاء، حدیث کے ضعف اور قوت کے اسباب، حدیث کی قسمیں، قرون اولیٰ کے محدثین کی اس میں مہارت اور عہد حاضر میں اس فن میں علماء کی بے بضاعتی وغیرہ۔ دوسری فصل کا عنوان ہے احادیث کے جمع و تدوین کا آغاز، اس سلسلہ میں نواب صاحب رقم طراز ہیں:

''سب سے پہلے جس شخصیت نے جمع اور تدوین حدیث کے سلسلہ میں حکم صادر فرمایا وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں، انھوں نے سلطنتِ اسلامیہ کے گوشہ گوشہ میں یہ فرمان لکھ کر بھجوایا کہ نبی کریم ﷺ کی حدیثوں پر غور کرو اور انھیں جمع کرو۔ اس سے پہلے صحابہ و تابعین کے درمیان حدیثوں کے لکھنے کا مستقل رواج نہیں تھا، البتہ بعض صحابہ اور تابعین کے یہاں ان کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے بعض اجزاء اور صحف موجود تھے، پھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابوبکر محمد بن حزم تابعی کو خاص طور سے لکھا کہ نبی کریم ﷺ کی احادیث کو چھان پھٹک کر درجِ دفتر کرلو''۔[۵]

ابتداء میں تدوینِ حدیث صرف نقلِ حدیث تک محدود رہی، پھر اس فن کے ماہرین نے اپنے اپنے طریقوں سے اسے جمع کرنا شروع کیا کسی نے فقہی تربیت اختیار کی، کسی نے جوامع اور مسانید مرتب کیے، کسی نے اجزاء وصحف کی ترتیب قائم کی، کسی نے استخراج و استدراک کا طریقہ اختیار کیا، کسی نے علل اور موضوعات کو ہدف بنایا، تاکہ

کم زور اور گھڑی ہوئی حدیثوں کو سنت ثابتہ وصحیحہ سے الگ کر دیا جائے۔ اس باب میں آگے کی فصلوں میں جن مباحث پر نواب صاحب نے گفتگو فرمائی ہے وہ اس طرح ہیں: کتب احادیث میں ابواب کی ترتیب میں اختلاف کے مقاصد، کتبِ حدیث کی قسمیں، ناقلینِ احادیث اور اصحابِ اجتہاد پر تبصرہ۔ ان فصول میں بہت سے علمی نکات آ گئے ہیں جن سے نواب صاحب کی ذہنی اور علمی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتب ستّہ پر دو، دو تین، تین جملوں میں ایسا جامع تبصرہ کیا ہے جو سیکڑوں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلہ کا ایک علمی لطیفہ ملاحظہ ہو۔ پس منظر یہ ہے کہ بعض علمائے امت کا خیال ہے کہ صحیح بخاری کی شرح اب تک اُس کے شایان شان نہ ہوسکی۔ جب یہ بات امام شوکانیؒ سے کہی گئی اور اُن سے گذارش کی گئی کہ امّت کی طرف سے اس قرض کو ادا کریں تو انھوں نے برجستہ کہا: "**لاھجرۃ بعد الفتح**"۔ یہاں امام شوکانی نے الفتح سے مراد فتح الباری لیا ہے، یعنی ابن حجرؒ کی مشہور شرح بخاری کے بعد یہ قرض ادا ہو گیا۔ اس لطیف تعبیر میں جو علمی بلاغت ہے اس کا اندازہ کچھ اہل علم ہی کر سکتے ہیں۔

اسی طرح ایک لطیف علمی نکتہ امام ابوحنیفہؒ کے سلسلہ میں بھی بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''بعض بغض اور حسد رکھنے والے امام ابوحنیفہؒ کو قلیل البضاعۃ فی الحدیث کہتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ حدیثیں ان سے کم منقول ہیں۔ حالاں کہ ائمہ کبار کے سلسلہ میں اس طرح کی باتیں کہنے کی گنجائش نہیں۔ اصل میں امام ابوحنیفہؒ سے کم روایتیں اس لیے منقول ہیں کیوں کہ ان کے یہاں جرح مقدم ہے اور قبولیتِ حدیث کی شرائط اُن کے یہاں بہت سخت ہیں، پس جو لوگ کہتے ہیں کہ انھوں نے روایات سے بے اعتنائی برتی ہے اور جان بوجھ کر حدیثوں کو نظر انداز کیا ہے، وہ لوگ یا تو امام ابوحنیفہؒ کے حدیثی نقطۂ نظر کو نہیں سمجھ سکے یا جان بوجھ کر ان پر تہمت کشی کی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کی فقہی آراء کو روایات اور احادیث کا مستدل پاتے ہیں۔ وہ کسی مسئلہ کے ردّ و قبول میں احادیث کو نظر انداز نہیں کرتے، یہاں تک کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ احادیثِ

ضعیفہ کو بھی اپنی ذاتی رائے پر ترجیح دیتے ہیں، جس کی دلیل حدیثِ قہقہہ ہے۔ ان کے علاوہ جو دوسرے محدثین ہیں ان کے یہاں قبول روایت کے سلسلہ میں وسعت ہے اور اُن کی شرائط اتنی سخت نہیں ہیں، اس لیے ان کی حدیثیں زیادہ ہیں۔ واضح رہے کہ امام ابوحنیفہؒ ایک اعلیٰ درجہ کے مجتہد تھے اور شرائطِ قبولیتِ حدیث میں انھیں حقِّ اجتہاد حاصل تھا، لیکن بعد کی صدیوں میں ان کے اصحاب نے بھی شرائط میں وسعت اختیار کرلی، اس لیے اُن کے یہاں بھی روایتوں کی تعداد بڑھ گئی''۔[۶]

غرض یہ کہ پورا باب علمی افادات اور محدّثانہ نکات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ تفصیل کے طالب کو اصل کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

دوسرا باب علم حدیث کی مختلف شاخوں اور اس فن میں لکھی جانے والی کتابوں کے سلسلہ میں ہے۔ اس باب میں کل سترہ فصلیں ہیں اور مندرجہ ذیل مباحث پر گفتگو کی گئی ہے:

علم حدیث باعتبار روایت و درایت، حدیث میں ناسخ و منسوخ کا علم، علم حدیث میں اسناد کا مرتبہ، رواۃ حدیث کی ثقاہت اور ضعف، علم تلقین حدیث، قواعدِ جرح و تعدیل، اسماء الرجال، مولد و منشأ، تاریخ ولادت و وفات اور اساتذہ و شیوخ کے اعتبار سے راویانِ حدیث کی معرفت، نیز علم غریبِ حدیث، علم شرحِ حدیث، ادعیۃ الرسول، اور ادعیۂ ماثورہ، طب نبوی، متن حدیث، رموز حدیث اور وضعِ حدیث وغیرہ۔

ان ابواب سے جہاں نواب صاحب کی فن حدیث میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ امّہات کتب کے بارے میں آپ کی معلومات حیرت انگیز ہیں۔ اس کے علاوہ اس اہم حقیقت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے حفاظتِ حدیث کے سلسلہ میں جو اصول و قواعد ایجاد کیے ان کے لیے انھیں کتنی محنت اور جاں فشانی کرنی پڑی ہوگی۔ ہزارہا راویوں کے حالات کی چھان پھٹک، اس کے لیے اسفار، راویوں کی شناخت کے طریقے اور اصول و ضوابط بنانا اور اس سے سرِ مو انحراف نہ کرنا، سچ یہ ہے کہ معرفتِ اسناد کا علم امت کے لیے باعث صد افتخار ہے۔ یہ ہمارے اسلاف کی

لامحدود کدّ وکاوش اور عظیم الشان جدوجہد کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہم تاریخ کے اس اہم اور نازک موڑ پر بلاخوف تردید دنیا کی تمام قوموں کے سامنے ببانگِ دہل اعلان کرسکتے ہیں کہ ہم نے اپنے نبی کی تعلیمات بغیر کسی ادنیٰ تصرف وتحریف کے محفوظ کرلی ہیں اور اس کی حفاظت کے لیے ہم نے انسانی وسعت واستطاعت کے اعلیٰ ترین معیار کو چھولیا ہے۔ اس میدان میں کوئی قوم ہمارے مساوی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اس باب میں جرح وتعدیل کے بھی نہایت اہم قواعد آگئے ہیں۔ اس فصل میں بعض کتابوں پر نواب صاحب کا تبصرہ نہایت اہم ہے۔ مثال کے طور پر تاریخ ابن کثیر کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ابن کثیر کی تاریخ ۷۳۸ھ پر آکر ختم ہوجاتی ہے، یعنی اپنی وفات سے دو سال پہلے تک کے واقعات انھوں نے تحریر کیے ہیں، چوں کہ اس کے بعد کی کوئی تاریخ نہیں تھی اس لیے ہمارے شیخ مفتی شام شہاب الدین احمد بن یحییٰ السعدی نے ۷۴۱ھ سے تاریخ لکھنی شروع کی، جوانھوں نے ۸۱۵ھ تک لکھی، لیکن وہ بہ وجوہ شائع نہ ہوسکی اور ضائع ہوگئی''۔[۷]

تیسرے باب میں پانچ فصلیں ہیں اور اس میں ان موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے: اولاً کتب حدیث کے طبقات اور اُن کے مدارج ومراتب، ثانیاً وہ شرائط جن کی بنیاد پر کوئی حدیث احکام شرعیہ کے استنباط میں حجت ہوتی ہے۔ ثالثاً ضبطِ حدیث کے مناہج اور احادیث کا طریق تحمّل وادا، رابعاً محدّث کی خصوصیات اور خوبیاں اور لوگوں کی حدیث اور علم حدیث سے بے اعتنائی اور علم حدیث کا آغاز وارتقاء وغیرہ۔

کتب حدیث کے مدارج اور مقام پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کتب حدیث کے مختلف طبقات اور جداگانہ مقامات ہیں، اس لیے ان کے مقامات ومراتب کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان کتابوں کا یہ مقام ومرتبہ دراصل خود احادیث کی مختلف حیثیتوں کی بنا پر ہے۔ بعض احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہے، بعض صحت کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی تھیں، بعض احادیث کی سندیں کچھ کم زور ہیں، مگر انھیں دوسرے

طرق سے متابعات اور شواہد مل جاتے ہیں، جو انھیں مضبوط بنا دیتے ہیں، بعض احادیث سند کے اعتبار سے کم زور ہیں۔ انھیں شرائط کو معیار بنا کر کتبِ حدیث کو چار طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ طبقۂ اولیٰ میں موطّا اور صحیحین ہیں، کیوں کہ باتفاقِ محدّثین اِن کتب میں صرف وہ حدیثیں درج ہیں جو صحت کی اعلیٰ ترین شرائط پر پوری اترتی تھیں۔ موطا میں اگرچہ مراسیل اور منقطع السند حدیثیں بھی موجود ہیں مگر دوسرے طریقوں سے ان حدیثوں کی متصل سندیں مل جاتی ہیں۔ طبقۂ ثانیہ میں وہ کتابیں شامل ہیں جو صحیحین اور موطا کے معیار سے کم تر ہیں مگر ان کے مولفین بھی ثقاہت، عدالت، حفظ وضبط، نیز تبحّرِ علمی میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ ان کتابوں میں جن احادیث کو درج کیا گیا ہے ان میں کسی تساہل سے کام نہیں لیا گیا ہے اور ان کو طبقۂ محدثین میں وقار و استناد حاصل ہے۔ اس طبقہ میں سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور مجتبیٰ النسائی کو اولین مقام حاصل ہے۔ ابن ماجہ کی سنن کو بھی اس فہرست میں شامل کیا گیا ہے، مگر اس میں کچھ حدیثیں نہایت ضعیف، بلکہ موضوع ہیں، اس لیے ابن اثیر نے انھیں کتبِ صحاح ستہ میں شمار نہیں کیا ہے، بلکہ موطا امام مالک کو اس طبقہ میں جگہ دی ہے''۔[۸]

طبقۂ ثالثہ میں وہ مصنفات، جوامع اور مسانید ہیں جو بخاری اور مسلم سے پہلے اور بعد میں ترتیب دی گئی ہیں اور جن میں صحیح، حسن، ضعیف، منکر، شاذ، غرض ہر طرح کی روایات درج ہیں جیسے مسند ابی یعلیٰ، مصنف عبدالرزاق، بیہقی، طحاوی اور طبرانی وغیرہ۔

طبقۂ رابعہ میں احادیث کی وہ کتابیں جو بالعموم پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں اور صوفیوں اور واعظوں کی باتوں سے خلط ملط ہیں، یا صحابہ وتابعین کے آثار واخبار ہیں، یا بنی اسرائیل کے قصّے ہیں، یا حکیموں کے اقوال ہیں جنھیں قصہ گولوگوں نے احادیثِ نبوی سے ملا دیا ہے۔ اس طبقہ میں ابن حبّان کی الکامل، ابن عدی کی کتاب الضعفاء اور خطیب ابونعیم، جوزقانی، ابن عساکر، ابن نجّار اور دیلمی وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ اکثر اہل علم نے مسند خوارزمی کو بھی اسی طبقہ میں شامل کیا ہے۔

حدیث کی ان کتابوں پر امت کا اعتماد نہیں ہے اور اثبات عقیدہ وعمل کے لیے

انھیں بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، بلکہ اس میں موجود بہت سی چیزیں امت کی گمراہی کی بنیاد ہیں، اور فرقۂ مبتدعہ نے اپنے بہت سے دلائل یہیں سے اخذ کیے ہیں حالاں کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جنھیں اکابر اہل علم نے مختلف فنّی اسقام اور معایب کے پیش نظر روایت کے لائق ہی نہیں سمجھا ہے اور بہت بعد کے زمانہ میں ان کی تصنیف عمل میں آئی ہے، لطف کی بات یہ ہے کہ خود ان کے مصنفین کو بھی ان کی صحت پر اصرار نہیں ہے، اس لیے ان کی چھان پھٹک میں وہ اہتمام نہیں پایا جاتا جو احادیث نبوی کے شایان شان ہے۔

یہ باب بھی پچھلے ابواب کی طرح بہت سے مفید علمی نکات اور فن حدیث کے اصول وقواعد اور بیش بہا معلومات سے پُر ہے۔ مثلاً حدیث ضعیف پر عمل کے بارے میں علماء کے اقوال وآراء، مراسیل کے باب میں اہل علم کا نقطۂ نظر، صغار وکبار تابعین کے مراسیل کا حکم اور اُن میں تفاوت کی وجوہات، مراسیل کا حکم، حجّتِ مراسیل کی شرطیں، شرائطِ تحمّل وادا، اجازتِ حدیث کے طریقے اور سب سے اہم یہ کہ کن شرائط کو مکمل کر لینے کے بعد کوئی طالبِ حدیث محدّث کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔ وغیرہ

چوتھے باب میں نواب صاحب نے صحاح ستّہ اور ان کی شروح کا ذکر کیا ہے، نیز موطا امام مالک اور مسند امام احمد بن حنبل کی خصوصیات اور ان سے استفادہ کی راہ میں پائی جانے والی مشکلات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس باب میں آٹھ فصلیں ہیں۔ باب کا آغاز موطا امام مالک کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ موطا سے آغاز کرنے کی وجہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''موطّا کے ذکر سے اس باب کا آغاز اس لیے کیا گیا ہے، کیونکہ یہ کتاب زمانۂ تالیف اور شہرت کے اعتبار سے تمام کتبِ حدیث پر مقدم ہے۔ فن حدیث میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جسے ہمیشہ ہی سے اصحاب علم کا اعتبار حاصل رہا ہے اور بعد کے جامعین حدیث نے اس سلسلہ میں امام مالک کے منہج ہی کی اتباع کی ہے اور افضلیت متقدم ہی کو حاصل ہے۔

موطا کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالعزیز دہلوی نے بستان المحدثین میں لکھا ہے کہ تقریباً ایک ہزار اشخاص نے امام مالک کے زمانہ میں ہی ان سے موطا کی روایت کی ہے جن میں محدثین، صوفیائے کرام، فقہا اور امراء سب شامل ہیں۔ ان سب لوگوں نے اس کی سند امام صاحب سے تبرکاً حاصل کی ہے۔ان نسخوں میں سب سے زیادہ مشہور اور مروّج نسخہ یحییٰ بن یحییٰ المصمودی الاندلسی کا ہے، البتہ ان سے موطا کے تین ابواب چھوٹ گئے ہیں جو یہ ہیں: باب خروج المعتکف الیٰ العید، باب قضاء الاعتکاف اور باب النکاح فی الاعتکاف، اس کی نشان دہی زیاد بن عبدالرحمٰن اللخمی نے کی ہے، جنھوں نے امام مالکؒ کے مسلک کو اندلس میں سب سے پہلے رائج کیا۔اس طرح نواب صاحب نے موطا کے سولہ نسخوں کا تذکرہ کیا ہے اور اُن کے امتیازات کو بیان کیا ہے۔اس کے بعد موطا کی شروح کا تذکرہ ہے، جن میں بطور خاص شاہ صاحب کی شروح مسوّیٰ اور مصفّیٰ کا ذکر کیا ہے اور ان میں شاہ صاحب کا کیا منہج رہا ہے؟ اس کو مفصلاً بیان کیا ہے۔ ان کے علاوہ صاحبِ کشف الظنون کے حوالہ سے دیگر متعدد شروح کا بھی تذکرہ کیا ہے۔[۱۰]

موطا کے بعد صحیح بخاری کا تذکرہ کیا ہے ۔ ابتدا میں صحیح بخاری کی اہمیت اور حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا ہے کہ صحیح بخاری وہ پہلی کتاب ہے جس میں مکمل طور پر صحیح احادیث درج کی گئی ہیں اس میں موجود تمام احادیث ان ہی رواۃ سے مروی ہیں، جن کی ثقاہت پر علمائے جرح وتعدیل کا اتفاق ہے، اس لیے پوری امت نے قرآن مجید کے بعد صحیح بخاری کو سب سے زیادہ صحیح کتاب تسلیم کیا ہے۔ بخاری اور مسلم کی شرائطِ قبول کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ فرق بتاتے ہیں کہ بخاری کے نزدیک قبولیتِ حدیث کے لیے ملاقات مشروط ہے چاہے یہ ملاقات زندگی میں صرف ایک بار ہی کیوں نہ ثابت ہو جب کہ امام مسلم صرف معاصرت کی شرط لگاتے ہیں۔ بخاری کی مزید خصوصیات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے جہاں حدیث کی صحت کا اہتمام کیا ہے وہیں تراجم ابواب میں فقہی افادات اور حکیمانہ نکتوں کو ملحوظ رکھا ہے اور ایک ہی حدیث سے کئی مسائل مستنبط کیے ہیں۔ آخر میں صحیح بخاری کے تراجم ابواب، تعلیقات اور شروح پر سیر حاصل

گفتگو کی ہے۔[۱۱]

صحیح بخاری پر گفتگو کے بعد صحاح کی دوسری پانچوں کتابوں پر بحث ہے جس میں ان کتابوں کی خصوصیات، اہمیت، طریق استفادہ اور ان کی شروح کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس کے بعد مسند امام احمد بن حنبل پر گفتگو کی ہے۔ لکھا کہ یہ کتاب تیس ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے، جن میں سے تین سو حدیثیں ثلاثیۃ الاسناد ہیں۔ مزید فرماتے ہیں کہ مسند احمد میں اُن کے صاحبزادے عبداللہ اور ابوبکر القطیعی نے بھی بعض اضافات کیے ہیں، جو اٹھارہ مسانید پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کے صاحب زادہ عبداللہ نے اس کتاب کی ترتیب وتہذیب کا بھی کارنامہ انجام دیا ہے۔ مذکورہ اضافات کے بعد مسند کی حدیثوں کی تعداد چالیس ہزار ہوجاتی ہے۔

پانچویں اور آخری باب میں کتب ستہ کے مولفین اور امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے حالات زندگی بیان کیے ہیں۔ سب سے پہلے امام دارالہجرہ امام مالک بن انسؒ کے حالات لکھے ہیں۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ امام مالکؒ سچ مچ ایک عظیم محدث، فقیہ، علم سے محبت رکھنے والے اور نبی کریمؐ کے عاشق صادق تھے۔ یہی صورت حالت امام بخاریؒ کی ہے۔ ان دونوں بزرگوں کے احوال تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ بقیہ پانچوں محدثین (یعنی مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ) کا ذکر قدرے مختصر ہے۔ سب سے آخر میں امام احمد بن حنبل کی سیرت بیان کی گئی ہے جو قدرے تفصیل سے ہے۔ کتاب ان سطروں پر ختم ہوتی ہے:

''مذکورہ بزرگوں کی جلالتِ شان، بزرگی اور امامت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کتاب نہایت مختصر ہے، مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا، کیوں کہ اگر ہم تفصیل سے ان کی سیرت لکھنے لگیں تو ان کی علمی فتوحات اور ذاتی سیرت وکردار کے بیان میں دفتر کے دفتر بھی مختصر پڑ جائیں''۔[۱۲]

خلاصہ یہ کہ یہ کتاب لکھ کر نواب صدیق حسن خانؒ قنوجی نے ایک بہت بڑے علمی خلا کو پُر کر دیا ہے اور کوزے میں دریا، بلکہ سمندر کو سمو دیا ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ ڈاکٹر رضی حامد، نواب صدیق حسن خاں، جے کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی، مقدمہ کتاب، ص ۷ تا ۱۵

۲۔ نواب صدیق حسن خاں، کتاب الحطّہ فی ذکر الصحاح الستۃ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۸۵ء

۳۔ حوالہ سابق، ص ۱۲

۴۔ ڈاکٹر رضی حامد، نواب صدیق حسن خاں، ص ۸۶

۵۔ کتاب الحطّہ، فصل و فی مبدأ جمع الحدیث وتالیفہ وانتشارہ، ص ۵۹

۶۔ حوالہ سابق، فصل فی ذکر تقلۃ الحدیث من اہل الاجتہاد والحدیث، ص ۴۷

۷۔ حوالہ سابق، الفصل التاسع فی علم رجال الحدیث، ص ۹۲-۹۳

۸۔ حوالہ سابق، الفصل الاول من الباب الثالث فی طبقات کتب الحدیث، ص ۱۱۵-۱۱۴

۹۔ حوالہ سابق، الباب الرابع فی ذکر موطا مالک بن انس، ص ۱۵۸

۱۰۔ حوالہ سابق، الباب الرابع فی ذکر موطا مالک بن انس، ص ۱۶۱ تا ۱۶۸

۱۱۔ حوالہ سابق، الفصل الثانی من الباب الرابع فی ذکر صحیح البخاری، ص ۱۶۸ تا ۱۷۹

۱۲۔ حوالہ سابق، ص ۲۶۰

☆☆☆

ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کی چند اردو مطبوعات

	کتاب	مصنف	صفحات	قیمت
۱	معرکۂ اسلام و جاہلیت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۳۷	۹۰
۲	مذہب کا اسلامی تصور	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۵۹۱	۱۰۰
۳	مشترکہ خاندانی نظام اور نظریہ اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۰۲	۴۰
۴	وحدتِ ادیان کا نظریہ اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۹۲	۴۰
۵	آزادئ فکر و نظر اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۲۸	۴۰
۶	قرآن، اہلِ کتاب اور مسلمان	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۹۶	۷۰
۷	حضرت ابراہیم علیہ السلام	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۰۰	۶۰
۸	اہلِ مذاہب کو قرآن کی دعوت	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۸۴	۴۵
۹	کفر اور کافر قرآن کی روشنی میں	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۶۰	۲۰
۱۰	جرائم اور اسلام	مولانا محمد جرجیس کریمی	۲۲۴	۸۵
۱۱	مسلمانوں کی حقیقی تصویر	مولانا محمد جرجیس کریمی	۱۶۴	۵۵
۱۲	عہدِ نبوی کا نظامِ حکومت	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱۳۶	۳۰
۱۳	شیئر بازار میں سرمایہ کاری	ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی	۱۵۶	۴۵

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر-۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

نقد و استدراک

قرآن کریم اور فرضی داستانیں

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

تحقیقات اسلامی ۲۰۱۱ء کے دوسرے شمارہ (اپریل-جون) میں ڈاکٹر محمود حسن الٰہ آبادی کا ایک مقالہ بہ عنوان 'داستان نویسی اور قرآن و حدیث کے تاریخی واقعات' شائع ہوا ہے۔ میری نظر میں یہ مقالہ نہایت خطرناک اور قرآنی روح کے خلاف ہے۔ ہرچند کہ فاضل مقالہ نگار نے بہ ظاہر داستان کی تعریف کی ہے اور قرآن کے منشا کو بھی بیان کیا ہے، مگر انھوں نے ظلم یہ کیا ہے کہ کھینچ تان کر بعض قرآنی واقعات کو داستانوں کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔

انھوں نے یہ نہیں بیان کیا کہ داستانوں کا مقصد دلوں کو بہلانا، وقت گذارنا، تعجب خیز فرضی واقعات گھڑ کر عوام کو خوش کرنا، تھا۔ عہد قدیم یا عہد وسطیٰ میں یہ فن اس لیے ایجاد کیا گیا تھا، تاکہ رات کو عوام ایک جگہ جمع ہو کر انھیں سنیں اور لطف حاصل کریں۔ دیگر الفاظ میں داستانوں نے ایک زمانے میں وہ رول ادا کیا ہے جو آج کے زمانے میں نوٹنکی، سینما، ٹی وی اور ویڈیو وغیرہ ادا کرتے ہیں۔ داستان میں ایک ہیرو ہوتا ہے اور ایک ہیروئن۔ ہیرو ہیروین کے عشق میں دیوانہ ہو کر اس کی تلاش میں ملک ملک اور شہر شہر پھرتا ہے، بالآخر جنوں، مہرہ، اسمِ اعظم کے ذریعہ اس کو پالیتا ہے۔ یہ ساری داستانیں کامیڈی پر ختم ہوتی ہیں۔ ان میں ہیرو ہیروئن کو کلمہ طیبہ بھی پڑھوا دیتا ہے۔ اس بنا پر اردو کا فرانسیسی ناقد گارساں دتاسی کہتا ہے کہ ''مسلمان داستان گو تبلیغ اسلام کرنا کبھی نہیں بھولتا''۔ اردو داستانوں پر مرزا اسداللہ خان غالب نے عمدہ تبصرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''معزالدین فیروز بخت کی کشور کشائیاں، ابوالحسن جوہر کی نیرنگ نمائیاں، عجائبات حکیم قسطاس کی حیرت فزائیاں، ملکہ نوبہار کی رنگیں

ادائیاں، جمشید خود پرست کی زور آزمائیاں، منار منحوس کی بے حیائیاں،
مسلمین و کفار کی لڑائیاں، مسلمانوں کی بھلائیاں اور کافروں کی برائیاں''

لیکن یہ سارے کردار ذہن انسانی کی تخلیق تھے اور یہ واقعات کبھی پیش نہیں آتے تھے۔ان کا مقابلہ اور موازنہ قرآنی واقعات سے کرنا اپنی تاریخ اور اپنے عقیدہ میں شک پیدا کرنا ہے۔ داستان کا کچھ تعلق قرآن سے نہیں ہے۔ نبیوں کے قصوں میں جو اپنی طرف سے کچھ اضافہ کرتا ہے وہ شخص مردود ہے۔ داستانیں ناممکن الوقوع واقعات کا پلندہ ہوتی ہیں، مگر قرآنی واقعات اور نبیوں کے قصے عملی زندگی میں پیش آئے ہیں۔ داستان اور قرآن میں کوئی تال میل نہیں ہے۔ دونوں انسانوں کو مختلف سمتوں میں لے جاتے ہیں۔ داستانوں کے اندر جنسی واقعات کی گندگی ناگواری کا احساس پیدا کرتی ہے۔ قرآن انسان میں پاکیزہ اور اعلیٰ قدریں پیدکرنا چاہتا ہے، داستانیں اس کے برعکس منفی قدریں پیدا کرتی ہیں۔ جھوٹے، بناوٹی، پرتصنّع اور خیالی قصوں کی تخلیق داستانوں کا امتیاز ہے۔ داستانیں لطف و لذت حاصل کرنے، لوگوں کو خوش کرنے اور ان کی وقت گذاری اور Entertainment کے لیے لکھی جاتی تھیں، جب کہ قرآن مجید کے قصے انبیاء علیہم السلام کے قصص ہیں، جو سچے ہیں۔ داستانوں کی ساری کہانیاں فرضی اور ذہنی اختراع اور منفی قدروں کی حامل ہوتی ہیں، جب کہ قرآن انبیاء علیہم السلام کے واقعات کو زندگی کے حقائق بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہ کفار مکہ تھے جو قرآن کو اساطیر اور فرضی داستانیں کہتے تھے۔ اگر کوئی شخص قرآنی قصوں پر داستانوں کا اطلاق کرتا ہے وہ گویا کفار مکہ کی تائید کر رہا ہے اور قرآن مجید کو اساطیر الاولین بنانے کی کوشش کر رہا ہے، العیاذ باللہ۔ قرآنی واقعات کو داستانیں قرار دینے کی غلطی عربی کے مشہور ادیب توفیق الحکیم سے بھی سرزد ہوئی ہے۔ انھوں نے اصحاب کہف کے قصہ کو ڈرامہ (یعنی خیالی داستان) کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس ڈرامہ پر ڈاکٹر طہ حسین کا مقدمہ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ اس جرم میں طہ حسین بھی برابر شریک ہیں۔ توفیق الحکیم نے اپنے ڈرامہ میں اصحاب کہف کے ایجابی قصہ کو منفی انداز میں پیش کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اصحاب کہف غار میں ۳۰۹ برس چھپے رہے۔ جب وہ

غار سے باہر آئے تو زمانہ بدل چکا تھا، یہ لوگ جب شہر گئے تو زندگی کو اپنی قدروں سے دور پایا۔ بالآخر عاجز اور مایوس ہوکر غار کی طرف لوٹ آئے۔ اس طرح توفیق الحکیم نے یہ بات پیش کی ہے کہ جو زندگی اور زمانہ سے دور ہوگیا وہ معاشرہ کے ساتھ مل جل کر نہیں رہ سکتا۔ بہ الفاظ دیگر انھوں نے اصحاب کہف کو زندگی اور زمانہ سے پیچھے رہ جانے کے باعث سماج میں رہنے کے لیے نااہل قرار دیا۔ تعجب ہے کہ قرآن مجید تو ان نوجوانوں کی تعریف کرتا ہے اور انھیں ہدایت یافتہ کہتا ہے اور توفیق الحکیم ان کو زندگی کے لیے نااہل قرار دیتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک طرح سے قرآن کی مقصد کی نفی کردیتے ہیں۔ بالکل یہی کام قرآنی قصوں پر لفظ داستان کا اطلاق کرکے کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ قرآن میں مذکور بیش تر قصے ماقبل تاریخ کے ہیں۔ ان کو تاریخی کہنا قابل غور ہے۔ اگر قرآنی قصوں کو تاریخی قصے مان بھی لیا جائے تو احادیث میں جو قصے بیان ہوئے ہیں وہ تاریخی نہیں ہیں۔ وہ سب عبرت ونصیحت کے لیے ہیں۔ ان کی تاریخ کا تعین ناممکن ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے مقالہ کی ابتدا میں بہت اطناب کے ساتھ داستان کی تعریف مغربی اور مشرقی مصنفین کے بیانات سے کی ہے۔ پھر مختلف زبانوں کی چند اہم داستانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے نفسیاتی طور سے داستانوں کا ایک ماحول پیدا کرکے اس کا قرآن مجید کے قصوں پر انطباق کرنا چاہا ہے۔ کسی مفسّر کی غلط بیانی، یا اسرائیلیات کے بیان میں اس کی مبالغہ آمیزی اور کسی داستان نویس کا قرآنی قصص کو داستان کے رنگ میں بیان کرنا، اس کی ذمہ داری نہ اسلام پر ہے اور نہ قرآن پر۔

مقالہ نگار نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ”کچھ اسلامی قصوں کی شکل بعض مفسرین نے بگاڑ دی ہے۔ بہت سے قرآنی قصے بائبل کی تبدیل شدہ شکل میں ہیں۔ اسرائیلیات نے تو اور ستم ڈھایا ہے۔ انبیاء کرام کے بعض قصوں میں اسرائیلیات کی چھاپ ہے۔ وحی یا الہام کے ساتھ جب غیر الہامی واقعات کو شامل کیا جائے گا

تو یہ داستان طرازی ہو جائے گی۔ 'سلیمان اور بلقیس'، 'یوسف زلیخا' اور 'ہابیل و قابیل' کے قصے اسی لیے داستانوں میں شمار ہوں گے۔

یہاں فاضل مقالہ نگار نے یہ حقیقت فراموش کردی کہ داستانوں کے قصے ناممکن الوقوع ہیں، مگر موجود ناولوں کے قصے اگر واقع نہ بھی ہوئے ہوتے تو بھی ممکن الوقوع ہیں۔ داستان خیال و ذہن کی تخلیق ہوتی ہے، جس کی خارج میں موجودگی یا امکان ضروری نہیں، جب کہ قرآن کا بیان حق ہے، اس لیے احسن القصص کو یا قرآن کے کسی قصے کو داستان قرار دینا نہایت گمراہ کن بات اور بدعقیدگی ہے۔ موصوف مزید لکھتے ہیں:

> ''بعض قرآنی قصوں میں اثری یا تاریخی و علمی تحقیقات نے ندرت پیدا کردی ہے، جیسے اصحابِ کہف کا قصہ، ذوالقرنین کا قصہ، لقمان حکیم اور خضرؑ کے قصے۔ ان تحقیقاتی تفصیلات کی وجہ سے انہیں داستانوں کی فہرست میں رکھا جا سکتا ہے، کیوں کہ یہ تفصیلات قرآن کے بیان پر غیر معارض اضافہ ہیں۔''

اس بیان پر دو اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ پہلا اعتراض ان کو داستان کہنے پر ہے اور دوسرا اعتراض اس پر ہے کہ یہ چیزیں قرآن پر اضافہ ہیں۔ یہ سارا اضافہ اور ساری اسرائیلیات مردود ہیں۔ کعب احبار اور وہب بن منبہ کے اضافات پر بھی علما نے نکیر کی ہے۔ خالص دینی اور عقائدی نقطۂ نظر سے قرآن کے کسی قصہ کو داستان نہیں کہا جا سکتا۔

جہاں تک حدیث میں مذکور قصوں کا معاملہ ہے تو فاضل مقالہ نگار نے بخاری، مسلم اور ترمذی کی صحیح احادیث سے استفادہ کیا ہے۔ ان قصص میں سے کوئی بھی تاریخی دور کا نہیں ہے۔ سب ماقبل تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم ان کے دور کا تعین کرنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا مقالہ نگار کی پہلی غلطی ان کو تاریخی کہنا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان قصوں کی نسبت حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے ہے اور یہ مرفوع روایتیں ہیں، لہٰذا ان کو ذہن و خیال کی تخلیق کردہ فرضی داستانوں میں شامل نہیں کر سکتے۔ قرآن کے قصوں میں قصہ گو حضرات نے اضافے کیے ہیں، مگر احادیث نبوی کے قصوں میں کسی نے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔

وضاحت

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

اپریل- جون ۲۰۱۱ء کے 'تحقیقات اسلامی' میں قرآن اور حدیث کی داستانوں کے موضوع پر مطبوع خاکسار کے مقالہ پر محترم پروفیسر سید احتشام احمد ندوی کا استدراک پیش نظر ہے۔ ناچیز اپنی کم علمی کے باعث موصوف کی فکر اور اپنی فکر کے فرق کو سمجھ نہیں سکا۔ خاکسار نے بھی تو یہی لکھا ہے کہ قرآن میں بیان کردہ تمام قصے صحیح ہیں۔ چونکہ داستان کی تعریف میں قصوں کا فرضی (fictitious) ہونا لازمی ہے، اس لیے قرآنی قصوں کو داستان نہیں کہا جاسکتا۔ ناچیز نے قرآنی قصوں کو داستان کہنے کے امکان (جواز نہیں) پر دس نکاتی مبادیات (premises) قائم کیے، جن کی رو سے قرآنی قصوں کو داستان کی صف میں رکھا جاسکتا ہے۔ ان مبادیات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن آں محترم سے سوال ہے کہ مولانا جامی کی یوسف زلیخا یا قصۂ سلیمان وبلقیس یا مثنوی مولانا روم میں قرآنی تلمیحات سے بھرپور بے شمار قصوں کو وہ کس صف میں رکھیں گے؟ کیا انھیں احسن القصص کی صف میں جگہ مل سکتی ہے؟ یہی حال تقریباً دوسرے تمام قصوں کا ہے۔ آخر اسرائیلیات ہی نے تو ان واقعات کو سچے قصوں کی صف سے نکال کر داستان کی صف میں جگہ دلوائی ہے۔

محترم موصوف نے احادیث کے قصوں کو ماقبل تاریخ کے قصے کہا ہے۔ وہ قصے ماقبل تاریخ کے ہوں یا ان کی حیثیت فقط تمثیل کی ہو، دونوں صورتوں میں ان قصوں کو داستاں کی صف سے علیٰحدہ کرنے کی کیا دلیل ہے؟۔

موصوف نے ابتدا میں ناچیز کی بیان کردہ داستان کی تعریف میں مقصد کی وضاحت نہ ہونے کی بنا پر اسے نامکمل قرار دیا ہے، حالاں کہ مولانا سعود عالم قاسمی کی نقل کردہ عبارت میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ لیکن کیا کسی اصطلاح کی تعریف میں اگر مقصد کو نظر انداز کر دیا جائے تو تعریف نامکمل رہ جائے گی؟ واضح رہے کہ عاجز نے داستان کی تعریف متعین کرنے میں بہت سے علمائے ادب کے حوالے دیے ہیں۔

یہ ایک علمی اور فنّی بحث ہے، اس کا قرآنی واقعات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ اپنی جگہ ثابت شدہ ہیں۔

کارکنانِ ادارۂ تحقیق کی بعض تصانیف

جومرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے شائع ہوئیں

۱-	مومنانہ زندگی کے اوصاف	مولانا سلطان احمد اصلاحی	-/۸۰
۲-	اسلام اور آزادئ فکر وعمل	،،	-/۳۵
۳-	کم سنی کی شادی اور اسلام	،،	-
۴-	بچوں کی مزدوری اور اسلام	،،	-/۵
۵-	بندھوا مزدوری اور اسلام	،،	-/۳
۶-	دعوت دین کے علمی تقاضے (ترجمہ)	،،	-/۹۵
۷-	قرآن اور سائنس (ترجمہ)	،،	-/۳۰
۸-	انسانی معاشرہ اسلام کے سایے میں (ترجمہ)	،،	-
۹-	حضرت ابراہیم علیہ السلام	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	-/۶۰
۱۰-	حقائق اسلام- بعض اعتراضات کا جائزہ	،،	-/۵۶
۱۱-	کفر اور کافر قرآن کی روشنی میں	،،	-/۲۰
۱۲-	قرآن کریم کا اعجاز بیان (ترجمہ)	،،	-/۷۵
۱۳-	سیرت رسول- دروس اور نصائح (ترجمہ)	،،	-/۲۰۰
۱۴-	عہد نبوی کا مدنی معاشرہ (ترجمہ)	،،	-/۱۶۰
۱۵-	اسلام اور مغرب کی کش مکش (ترجمہ)	،،	-/۹۰
۱۶-	علم تفسیر- چند بنیادی مسائل (ترجمہ)	،،	-/۸
۱۷-	جرائم اور اسلام	مولانا محمد جرجیس کریمی	-/۸۵
۱۸-	مسلمانوں کی حقیقی تصویر	،،	-/۵۵

≐ ملنے کے پتے ≐

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

تعارف وتبصرہ

برصغیر ہند میں علوم فقہ اسلامی کا ارتقاء ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

ناشر: ایفا پبلی کیشنز، ۱۶۱-ایف، جوگا بائی، نئی دہلی-۲۵، ۲۰۱۲ء، صفحات ۲۵۲، قیمت-/۱۵۰ روپے

ہندوستانی علماء نے علوم اسلامیہ کی مختلف شاخوں کے ساتھ فقہ پر بھی خصوصی توجہ دی ہے اور اس میں عربی اور فارسی کے ساتھ اردو میں بھی گراں قدر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں فقہ کے موضوع پر اردو زبان میں شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست سازی کی گئی ہے اور ان میں سے کچھ اہم کتابوں کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔ درحقیقت یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے، جس پر فاضل مصنف کو شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے ایم فل کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ اسے اصلاً انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا اور اس کی اشاعت بھی ہوگئی تھی۔ اب خود مؤلف نے اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے اور اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی نے اپنے اشاعتی ادارہ سے اسے شائع کیا ہے۔

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں برصغیر میں فقہ اسلامی کے ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے ۱۸۵۷ء سے قبل کی فقہی خدمات کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ باب دوم میں ان کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے جو اصلاً عربی، فارسی یا انگریزی زبانوں میں لکھی گئی تھیں، بعد میں اردو زبان میں ان کا ترجمہ کیا گیا۔ باب سوم میں اسی انداز سے اردو میں تالیف کی جانے والی طبع زاد کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ اسے تاریخ، اصول فقہ، عمومی موضوعات، نماز، زکوٰۃ، حج وقربانی، معاشرتی مسائل، معاشی مسائل، جرائم و تعزیرات، بین الاقوامی قوانین، عدالتی نظام اور حظر واباحت وغیرہ کے ذیلی عناوین کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ باب چہارم میں ہندوستان کے فقہی مدارس ومکاتب اور علمی مراکز کی فقہی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب پنجم میں اردو فقہی مطبوعات میں سے چند اہم کتابوں کو منتخب کرکے ان کا کسی قدر تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔ باب ششم میں پاکستان میں علم فقہ کے ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے اور وہاں کی جامعات اور علمی مراکز میں ہونے

والے کاموں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

کتاب کے پیش لفظ میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے ادارہ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے شعبۂ فقہ کے بعض طلبہ سے سنہ ۲۰۰۰ء تک کی اردو مطبوعاتِ فقہ کا تعارف مرتب کروایا تو ان کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ زیرِ نظر کتاب کے مؤلف نے پانچ سو سے کچھ زائد مطبوعات کی فہرست پیش کی ہے اور ان میں سے ۸۷ کتب کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام مکاتب فکر- دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، شیعہ وغیرہ- کے علماء کی فقہی کاوشوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے خاصی محنت کی ہے اور جن کتابوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے بیش تر تک براہ راست رسائی حاصل کی ہے۔ لیکن انھوں نے مقدمہ میں اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ بعض کتابیں براہ راست ان کے مطالعہ میں نہیں آسکیں، لیکن ان کی اہمیت کے پیش نظر ان کا بھی تذکرہ شامل کیا ہے اور ان کے بارے میں معلومات ثانوی مراجع سے لی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے بہت سی فروگزاشتیں کتاب میں در آئی ہیں، جنھیں کسی تحقیقی مقالہ میں ہرگز نہیں ہونا چاہیے، جب کہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے سُپر وائزر پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی نے کتاب کا حرف حرف دیکھا ہے اور پورے مواد پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے (ص۱۲)۔ بہ طور مثال چند فروگزاشتوں کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

مصنف نے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہونے والی کتاب 'اسلامی قانون فوج داری' کا تذکرہ کئی مقامات پر الگ الگ انداز سے کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ''یہ کتاب اصلاً فارسی زبان میں ہے۔ اس کا نام کتاب الاختیار ہے۔ اس کے مؤلف اور زمانۂ تالیف کا سراغ نہیں لگ سکا''۔ (ص۱۷۸-۱۷۹) دوسری جگہ لکھا ہے کہ ''سلامت علی خاں کی اس فارسی کتاب کو مولانا عبدالسلام ندوی نے اردو زبان کا جامہ پہنایا'' (ص۹۹) تیسری جگہ سلامت علی خاں کا نام اردو مترجم کی حیثیت سے درج کیا

ہے (ص ۱۷۸-۱۷۹) سرسید کی کتاب کا نام ایک جگہ رسالہ طعام اہل کتاب (ص ۱۴۱) اور دوسری جگہ احکام طعام اہل کتاب (ص ۸۳) لکھا ہے۔ ایک جگہ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی کی کتاب 'اسلام اور موسیقی' کی ضخامت ۵۳۲ صفحات بتائی ہے (ص ۸۳) دوسری جگہ اس کا تذکرہ ایک کتابچہ کی حیثیت سے کیا ہے (ص ۱۸۳) مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ''نس بندی اور اسلام آپ کی مستقل فقہی تصنیف ہے'' (ص ۱۰۱) حالاں کہ اس کا صحیح نام 'نشہ بندی اور اسلام' ہے اور یہ مختصر سا کتابچہ ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ''مولانا محمد یوسف اصلاحی کی کتاب 'فقہ اسلامی' دو جلدوں میں ہے، دوسری جلد کا عنوان 'آسان فقہ' ہے جو مکتبہ ذکریٰ رام پور سے شائع ہوئی'' (ص ۵۵) حالاں کہ یہ دونوں الگ الگ کتابیں ہیں۔ 'فقہ اسلامی' صرف ایک جلد میں ہے اور یہ نصابی کتاب ہے، جو مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے اور 'آسان فقہ' کی دو جلدیں ہیں، جو مکتبہ ذکریٰ سے شائع شدہ ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی بہشتی زیور کو ایک جگہ گیارہ اجزاء پر مشتمل بتایا ہے (ص ۴۹) اور دوسری جگہ بارہ اجزاء پر (ص ۱۴۰)۔ مولانا منہاج الدین مینائی کی کتاب 'اسلامی فقہ' کو تین جلدوں پر مشتمل بتایا ہے (ص ۴۹) حالاں کہ وہ صرف ایک جلد میں مکتبہ الحسنات دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ مفتی محمود حسن کا سنہ وفات ۱۹۹۷ء لکھا ہے، ساتھ ہی یہ بھی تحریر کیا ہے کہ وہ انیسویں صدی کے کہنہ مشق فقیہ تھے (ص ۱۵۸) ایک جگہ لکھا ہے کہ ''ابن رشد کی کتاب 'بدایۃ المجتہد' کا اردو ترجمہ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی کے قلم سے بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد سے شائع ہوا ہے'' (ص ۱۰۴) حالاں کہ اس کی اشاعت دارالتذکیر لاہور سے ہوئی ہے۔ مولانا مجیب اللہ ندوی کا سنۂ وفات ایک جگہ ۲۰۰۶ء لکھا ہے (ص ۱۷۲) اور دوسری جگہ ۱۹۰۶ء (ص ۱۳۸) اور ان کی کتاب 'اسلامی فقہ' کے بارے میں لکھا ہے کہ ''وہ ماہنامہ الرشاد کے سوال و جواب کے علاوہ مزید اضافوں کے ساتھ تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے'' (ص ۱۳۸) حالاں کہ ماہنامہ الرشاد ۱۹۸۳ء سے نکلنا شروع ہوا جب کہ اسلامی فقہ کی اشاعت اول ۱۹۵۷ء میں ہو چکی تھی۔ جامعۃ الرشاد سے شائع ہونے والی کتاب 'جہیز

کی شرعی حیثیت' کے مصنف کا نام محمد سعد اللہ لکھا ہے (ص ۱۷) جب کہ صحیح نام مجیب اللہ ندوی ہے۔ مولانا سید احمد عروج قادری اور ان کے فتاویٰ بہ عنوان 'احکام و مسائل' کا تذکرہ متعدد مقامات پر کیا ہے (ص ۲۸، ۲۹، ۶۷، ۱۲۵، ۱۶۸، ۱۶۹) مگر ہر جگہ مصنف کا نام سید عروج احمد قادری لکھا ہے جب کہ عروج ان کا نام نہیں، بلکہ تخلص تھا۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ احکام و مسائل کی اشاعت دو جلدوں میں مکتبہ زندگی دہلی سے ہوئی (ص ۴۸) اور دوسری جگہ اس کا ناشر مرکزی مکتبہ رام پور کو قرار دیا ہے (ص ۱۶۸) جب کہ یہ دونوں بیانات صحیح نہیں ہیں۔ اس کی اشاعت مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے ہوئی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ تاسیس ۳۰ رمئی ۱۸۶۷ء تحریر کی ہے۔ آگے لکھا ہے کہ مظاہر علوم کا سنگ بنیاد دارالعلوم کے قیام کے چھ مہینے بعد رکھا گیا، مگر اس کی تاریخ نومبر ۱۸۶۶ء درج کی ہے (ص ۹۵)۔

بعض بیانات مکرر ہوگئے ہیں۔ مثلاً اسلامک فقہ اکیڈمی کے ۲۰ سمیناروں کا تذکرہ ص ۱۱۲-۱۱۶ پر ہے اور دو صفحات کے بعد ص ۱۱۹-۱۲۰ پر بھی۔

اس طرح کی فروگزاشتیں اور بھی بہت سی ہیں، جن سے کتاب کا تحقیقی معیار مجروح ہوا ہے۔ بہ ہر حال بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب برصغیر ہندو پاک کی فقہی خدمات پر ایک عمدہ کاوش ہے۔ امید ہے فقہ اور اس کی تاریخ سے دل چسپی رکھنے والے اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

اخوان المسلمون- تزکیہ، ادب، شہادت ڈاکٹر عبید اللہ فہد

ناشر: القلم پبلی کشنز، ٹرک یارڈ، بارہمولہ، کشمیر، پروڈکشن: اردو بک ریویو، نئی دہلی-۲، سنۂ اشاعت ۲۰۱۱ء، صفحات: ۳۱۲، قیمت: ۲۱۰ روپے

آج عالم عرب میں عوامی بیداری کی جو لہر آئی ہوئی ہے اور سیاسی طور پر اسلام کی بالادستی کی جو کش مکش عروج پر نظر آرہی ہے وہ مصر میں ابتدائی طور سے تشکیل شدہ، پھر شام، سوڈان، اردن، فلسطین، کویت، یمن اور شمالی افریقہ میں توسیع پذیر اسلامی تحریک

'اخوان المسلمون' کی عظیم الشان جدوجہد، بے پناہ قربانی وایثاراور بے بدل رفاہی وفلاحی خدمات کا ثمرہ ہے۔ یہ تحریک مارچ ۱۹۲۸ء میں مصر کے ایک قصبہ اسماعیلیہ میں شیخ حسن البنّا (۱۹۰۶- ۱۹۴۹ء) کی ولولہ انگیز قیادت میں قائم ہوئی اور دیکھتے دیکھتے مصری نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئی۔

'اخوان المسلمون' کی تشکیل ایسے دور میں ہوئی جب مصر میں وطنیت، الحاد اور مغرب پرستی نے اپنے اثرات ڈالنے شروع کردیے تھے اور روایتی اسلام اور تجدّد کے مابین تصادم اور کش مکش کا آغاز ہوگیا تھا۔ چنانچہ الشعر الجاہلی (ڈاکٹر طہ حسین) تحریر المرأۃ (قاسم امین) اور الاسلام واصول الحکم (شیخ علی عبدالرزاق) جیسی کتابوں نے اسلام کی روایتی بنیادوں پر تیشہ زنی کی کوشش شروع کردی تھی۔ ان کے مقابلے میں سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہٗ، سید رشید رضا، مصطفیٰ صادق الرافعی، محمد فرید وجدی اور محبّ الدین الخطیب جیسے اسلام پسند مصلحین کی آواز کم زور اور دھیمی تھی۔ 'اخوان المسلمون' نے اس تحریک میں جان ڈال دی اور اسے علمی اور سیاسی رخ عطا کیا۔ اخوان نے اپنی تشکیل کے دن سے آج تک مختلف مراحل طے کیے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب انہی مراحل کی تفصیل پیش کرتی ہے۔

فاضل مصنف نے سات بڑے عناوین کے تحت اخوان کی تاریخ، طریقۂ کار، نظامِ تربیت اور آزمائشوں میں استقامت و پامردی کی تفصیلات کافی وضاحت کے ساتھ پیش کی ہیں۔ سب سے پہلا عنوان ہے 'حسن البنا شہید سے ڈاکٹر محمد البدیع تک'۔ اس کے تحت اخوان کی تاسیس سے اب تک آٹھ مرشدین عام کی مختصر سوانح اور ان کا فکری، تنظیمی اور تربیتی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے عنوان 'تصوف اور سیاست کا اجتماع' کے تحت بانی تحریک شیخ حسن البناء کی فکر کی ترجمانی کی گئی ہے۔ تیسرے عنوان 'تشدّد سے گریز، مزاحمت کی تلقین' کے تحت اخوان کی دعوت اور خدمات کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ اگلا عنوان ہے 'ادب کی حلاوت بھی، ایمان کی حرارت بھی'۔ اس کے ذیل میں قائدین اخوان کی خودنوشتوں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ پانچویں عنوان 'دانش وروں اور

ادیبوں کی کہکشاں' کے تحت اخوان کے آٹھ مرشدین عام کے علاوہ دیگر اہم شخصیات مثلاً سید قطب، عبدالقادر عودہ، مصطفیٰ محمد الطحّان، طٰہٰ جابر العلوانی، عماد الدین خلیل، عبدالحمید احمد ابوسلیمان، فتحی یکن، سعید رمضان، محمد قطب، زینب الغزالی، محمد الغزالی، مصطفیٰ السباعی، عبدالبدیع صقر، عبدالفتاح ابوغدّہ، محمد محمود الصواف اور نجیب الکیلانی کی مختصر سوانح رقم کی گئی ہے۔ چھٹا عنوان ہے 'شہادت گہہ الفت میں'۔ اس کے تحت اخوان کے نظام تربیت کے لازوال نقوش نمایاں کیے گئے ہیں۔ ساتویں عنوان 'اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ پاک باز' کے تحت اخوان کی قلبی طہارت اور ان کے درمیان باہمی اخوت سے متعلق سبق آموز واقعات درج کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب عصر حاضر کی ایک اہم اسلامی تحریک کی مکمل تاریخ پیش کرتی ہے۔

عالمی اسلامی تحریکات میں 'اخوان المسلمون' کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ مصر کے ایک مسلم ملک ہونے کے باوجود اس کے حکم رانوں شاہ فاروق اور جمال عبدالناصر سے لے کر حسنی مبارک تک سب نے اس پر نہ صرف یہ کہ پابندی عائد کی، بلکہ اس کے کارکنوں کو مسلسل قید و بند اور تشدد و تعذیب کا نشانہ بنایا، مگر انھوں نے استقامت و پامردی کا ثبوت دیا اور صحابہ کرامؓ کے دور کی یاد تازہ کردی۔ مصری حکم رانوں نے ان کے بہت سے ارکان کو دس دس، بیس بیس برس، بلکہ اس سے زیادہ مدت تک جیلوں میں بند رکھا اور متعدد اہم شخصیات کو پھانسی پر چڑھادیا، مگر انھوں نے ان ظالم حکم رانوں کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور اسلامی نظام کے قیام کی پرزور وکالت کرتے رہے۔

اخوان کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تنظیم طویل مدت سے قائم ہے اور لاکھوں افراد (مرد و عورت) اس سے وابستہ ہیں۔ آج کے دور میں کسی دینی مقصد کے تحت لوگوں کو اتنی کثیر تعداد میں جمع کرلینا اور پھر ان کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم رکھنا تنظیم کے داخلی استحکام اور مضبوط نظام تربیت و احتساب کے بغیر ممکن نہیں۔ فاضل مصنف نے اخوان کی ان دونوں خصوصیات کو نمایاں کیا ہے۔

عالمی اسلامی تحریکات پر فاضل مصنف کی خصوصی نظر ہے۔ قبل ازیں ان کی دو

کتابیں 'تاریخ دعوت و جہاد- برصغیر کے تناظر میں' اور 'جدید ترکی میں اسلامی بیداری' شائع ہوچکی ہیں۔ زیرنظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اپنے مواد اور پیش کش کے لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔ (محمد جرجیس کریمی)

عصر حاضر کی نفسیاتی الجھنیں اور ان کا اسلامی حل مولانا سلطان احمد اصلاحی

عصر حاضر کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس میں انسان نے زندگی کے ہر میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ سائنس اور تکنالوجی میں غیر معمولی پیش رفت کے نتیجے میں اسے بے شمار سہولیات حاصل ہوگئی ہیں۔ مسافتیں سمٹ گئی ہیں، پہلے جن مقامات تک ہفتوں اور مہینوں میں پہنچا جاتا تھا، اب ان تک منٹوں اور گھنٹوں میں پہنچا جاسکتا ہے۔ اسبابِ آسائش کی فراہمی نے زندگی کو آرام دہ اور پرتعیش بنا دیا ہے۔ رہن، سہن، خوردونوش اور دیگر معاملات میں اس قدر فرق آ گیا ہے کہ پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، لیکن المیہ یہ ہے کہ ان غیر معمولی ترقیوں نے انسان کو سکون فراہم کرنے کے بہ جائے اسے اضطراب اور بے چینی میں مبتلا کردیا ہے۔ ننانوے کے پھیر میں اس کی زندگی اجیرن بن گئی ہے۔ وہ ہر وقت زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے اور معیارِ زندگی کو بلند سے بلندتر کرنے میں سرگرداں رہتا ہے۔ خورد ونوش میں اصولِ صحت کو ملحوظ نہ رکھنے کے نتیجے میں طرح طرح کے امراض وعوارض رونما ہورہے ہیں۔ جنسی بے اعتدالی کی بنا پر پرمسرت ازدواجی زندگی خواب بن گئی ہے۔ مال و دولت، عیش و آرام اور دیگر معاملات میں پسندیدہ معیار تک نہ پہنچ پانے کی صورت میں زندگی گھٹ گھٹ کر گزرتی ہے یا بے صبری کے نتیجے میں خودکشی کے واقعات کثرت سے پیش آنے لگتے ہیں۔ کرپشن، بدعنوانی، رشوت ستانی، حقوق کی پامالی، لوٹ کھسوٹ، ظلم وتشدد اور سماج میں پھیلی ہوئی دیگر برائیاں اسی صورت حال کے مختلف مظاہر ہیں۔ الغرض موجودہ دور کا انسان اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود طرح طرح کے اخلاقی مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے، جن سے نجات کی اسے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی ہے۔

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ وہ انسان کے معاشرتی، سیاسی اور دیگر تمام مسائل کا حل رکھتا ہے۔ وہ انسان کو ذہنی اطمینان وسکون فراہم کرتا ہے۔ سماج کی بہتر تشکیل کے لیے اخلاقی اصول وضوابط بیان کرتا اور اپنے ماننے والوں کو ان کا پابند بناتا ہے۔ وہ انسانوں کو اپنے معاشی حالات بہتر بنانے کی جدو جہد کرنے کی ہدایت دینے کے ساتھ موجودہ حالات پر راضی بہ رضا رہنے کی تلقین کرتا اور بے صبری سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔ وہ دوسروں کے حقوق پامال کرنے سے سختی سے روکتا اور ہر صاحبِ حق تک اس کا حق پہنچانے کا حکم دیتا ہے۔ اس طرح اس کی تعلیمات خوش گوار زندگی کی ضمانت فراہم کرتی ہیں اور ان پر عمل کرنے سے انسانی سماج امن وامان کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

زیرنظر کتاب میں سماجی، معاشی، اخلاقی اور نفسیاتی اعتبار سے معاصر دنیا کی صورت حال کا جائزہ لینے کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ موجودہ دور کے انسانوں کی ان الجھنوں کو اسلام کس طرح حل کرتا ہے اور خوش گوار زندگی گزارنے کے لیے کون سے زرّیں اصول بیان کرتا ہے۔ ان اصولوں کی اہمیت یہ ہے کہ وہ محض نظری نہیں ہیں، بلکہ ایک عرصہ تک ان پر انسانوں کی بڑی تعداد عمل کرتی رہی ہے اور ان کے معاشرہ نے امن وسکون کا مثالی نمونہ پیش کیا ہے۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی نے ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کی جانب سے تفویض کردہ علمی منصوبہ کے تحت 'اسلام- ایک نجات دہندہ تحریک' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب تیار کی تھی۔ زیرنظر کتاب اصلاً اس کا تیسرا حصہ ہے۔ اس سے قبل اس کے دو حصے 'اسلام- ایک نجات دہندہ تحریک' اور 'عصر حاضر کا سماجی انتشار اور اسلام کی رہ نمائی'، کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان تینوں حصوں کو ملا کر پڑھا جائے تبھی ان کی مکمل بحث کو اچھی طرح سمجھا اور اس سے کما حقہ استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ (م۔ر)

کتابیاتِ شبلی ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ناشر: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء، صفحات: ۲۷۱، قیمت -/۲۵۰ روپے

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے علامہ شبلی نعمانی (م۱۹۱۴ء) اور دبستانِ شبلی کے

تذکرہ کو اپنے لیے بحث وتحقیق کا موضوع منتخب کیا ہے۔علامہ شبلی کی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر ان کی تحریروں کا مجموعہ 'متعلقات شبلی' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور دبستان شبلی کا جامع تذکرہ ان کی کتاب 'دارالمصنفین کی تاریخی خدمات' میں آ گیا ہے۔اس کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا شاہ معین الدین ندوی، مولانا سعید انصاری اور مولانا مجیب اللہ ندوی وغیرہ پر ان کی مستقل تصانیف شائع ہوچکی ہیں۔ انہی خدمات کی بنا پر انھیں دارالمصنفین کا اعزازی رفیق منتخب کیا گیا ہے اور اب ان کی زیرِ نظر کتاب دارالمصنفین ہی سے شائع ہوئی ہے۔

علامہ شبلی کی حیات اور کارناموں پر خود ان کی زندگی میں بہت کچھ لکھا گیا اور اس کے بعد بھی مسلسل لکھا جاتا رہا ہے۔اس موضوع پر متعدد اشاریے بھی شائع ہو چکے ہیں۔آخری اشاریہ، جسے جناب کبیر احمد خاں لائبریرین ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے مرتب کیا تھا، ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔اس دوران مولانا شبلی کی حیات وخدمات پر کئی سمینار منعقد ہوئے، کئی رسائل کے خصوصی شمارے شائع ہوئے اور بہت کچھ نیا لٹریچر سامنے آیا۔زیرنظر اشاریہ میں قدیم اشاریوں کی تحقیق وتنقیح کے ساتھ نئے اضافات کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔اس طرح یہ علامہ شبلی پر تیار ہونے والے اشاریوں میں سب سے زیادہ جامع ہوگیا ہے۔

یہ اشاریہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں علامہ شبلی کی تمام تالیفات، تلخیصات، تراجم اور مضامین ومقالات کا تذکرہ ہے۔دوسرا حصہ علامہ کی شخصیت اور خدمات پر لکھی جانے والی کتابوں، مضامین، رسائل کے خصوصی شماروں، عصری جامعات میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے لکھے جانے والے مقالات کا احاطہ کرتا ہے۔ مضامین کو موضوعاتی اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔تیسرے حصے میں علامہ کی تصانیف پر لکھے جانے والے مقالات اور نقد وتبصرہ کی فہرست مرتب کی گئی ہے۔اسی حصے میں ان پر لکھی جانے والی انگریزی وہندی کتب ومضامین کی فہرست درج کی گئی ہے۔چوتھا حصہ مصنفین، مترجمین اور مقالہ نگاروں کے اشاریہ پر مشتمل ہے۔

فاضل اشاریہ نگار نے کتاب میں ایک ہزار سات سو اندراجات کو سلیقہ سے مرتب کیا ہے اور علامہ شبلی کی تصانیف اور مقالات کی فہرست سازی کے ساتھ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر لکھی جانے والی کتب اور مضامین و مقالات کی موضوعاتی فہرست بہت محنت سے مرتب کی ہے، جس پر وہ بجا طور سے تحسین وتبریک کے مستحق ہیں۔

کتابیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالمصنفین سے علامہ شبلی کی سیرۃ النبی جلد اول کی چھٹی طباعت ۱۹۶۱ء میں اور جلد دوم کی پانچویں طباعت ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ اس سے قبل کی صرف ایک دو طباعتوں کا ذکر ہے۔ مقام حیرت ہے کہ شبلی پر ۹/ اشاریے مرتب کیے گئے، لیکن نہ اشاریہ نگار پتا لگا سکے، نہ دارالمصنفین کے ریکارڈ سے معلوم ہوسکا کہ سیرۃ النبی کی ابتدائی اشاعتیں کب کب منظر عام پر آئی تھیں۔

علامہ شبلی کے مضامین و مقالات پہلی مرتبہ کن رسائل میں شائع ہوئے اور بعد میں کن مجموعوں کا حصہ بنے؟ اشاریہ نگار نے دونوں کی صراحت کی ہے۔ لیکن مقالاتِ شبلی جلد اول کے مضامین کے بارے میں یہ تفصیل نہیں بیان کی گئی ہے۔ بعض اندراجات کی تکرار ہے، انھیں کسی ایک جگہ ہونا چاہیے تھا۔ مثلاً 'کتب خانۂ اسکندریہ' کا تذکرہ تصانیف شبلی (نمبر شمار ۲۷) میں بھی کیا گیا ہے اور دوسروں کے ذریعے مدوّن کی گئی کتب میں بھی (نمبر شمار ۸۷) اور 'مطائب شبلی' کا اندراج کتبِ مدوّنہ (نمبر شمار ۸۶) میں بھی ہے اور مطالعات شبلی پر مشتمل کتب میں بھی (نمبر شمار ۴۴۱)۔ بعض مقامات پر رسائل کے ماہ وسنہ کا اندراج رہ گیا ہے (مثلاً نمبر شمار ۳۶۹، ۱۰۹۱) اشاریہ نگار کے اپنے مضمون 'علامہ شبلی کا نظریۂ تاریخ' کا اندراج نمبر شمار ۶۸۵ پر بھی ہے اور ۶۸۸ پر بھی۔ کتابیات میں علامہ شبلی پر لکھی جانے والی انگریزی اور ہندی کتب ومضامین کی فہرست الگ سے مرتب کی گئی ہے، لیکن عربی اور فارسی کتب ومقالات کا تذکرہ علیٰحدہ نہیں کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ اشاریہ قدر شناسانِ شبلی کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے۔ امید ہے کہ اہلِ علم کے درمیان اسے بھرپور پذیرائی حاصل ہوگی۔ (م-ر)

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۴۳)

☆ صدر ادارہ وامیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری کی تصانیف کو الحمدللہ علمی و دینی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے۔ حال میں موصوف کی جن کتابوں کے نئے ایڈیشن منظر عام پر آئے ہیں وہ یہ ہیں: اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور، دعوت وتربیت- اسلام کا نقطۂ نظر، اسلام اور انسانی حقوق، کیا اسلام سے بہتر کوئی دعوت ہوسکتی ہے؟

☆ مولانا عمری کی تصانیف کا دیگر زبانوں میں برابر ترجمہ ہورہا ہے۔ حال میں جن کتابوں کا ہندی ترجمہ شائع ہوا ہے وہ یہ ہے: اسلام اور اس کا پیغام، صفحات ۳۲، قیمت -/۱۵ روپے، بچے اور اسلام، صفحات: ۱۶، قیمت -/۸ روپے، مانوسیوا- اسلام کی نظر میں، صفحات: ۲۴، قیمت -/۱۲ روپے۔ موخر الذکر کتاب اس سے قبل تلگو اور مراٹھی میں بھی شائع ہوچکی ہے۔ 'انسان اور اس کے مسائل' کا ترجمہ انگریزی، ہندی اور بعض دیگر زبانوں میں ہوچکا ہے۔ اب کنڑ میں اس کا ترجمہ سامنے آیا ہے۔

☆ معاون مدیر مجلّہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کے ایک مضمون بہ عنوان 'قرآن سے غفلت' کو پاکستان کے مشہور اشاعتی ادارہ 'منشورات' لاہور نے بڑے پیمانے پر عام کرنے کے مقصد سے کتابچہ کی صورت میں شائع کردیا ہے۔ صفحات: ۸۔ اسی طرح 'قرآن کریم کا سائنسی اعجاز' کے عنوان سے انھوں نے عربی کے ایک مضمون کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ تحقیقات اسلامی اکتوبر- دسمبر ۲۰۱۰ء میں شائع ہوچکا ہے۔ اب اسے اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی نے کتابچہ کی شکل میں شائع کیا ہے۔ صفحات: ۳۲، قیمت ۲۰ روپے۔

☆ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کے علی گڑھ چیپٹر اور شعبۂ دینیات (سنّی) مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے اشتراک سے Peace and Progress: Role of Religion کے عنوان سے علی گڑھ میں ۱۱-۱۲ر فروری ۲۰۱۲ء کو قومی سمینار منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ندوی نے اس میں شرکت کی اور 'عام تباہی کے اسلحوں کا استعمال: اسلام کا نقطۂ نظر' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

☆ رکن ادارہ مولانا محمد جرجیس کریمی نے ادارہ کے منصوبہ کے تحت 'اسلام کی امتیازی

خصوصیات' کے عنوان سے کتاب تیار کی تھی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ صفحات: ۲۱۲، قیمت -/۱۰۰ روپے

☆ ادارۂ تحقیق میں ایک نئے محقق ڈاکٹر صادق اختر ندوی کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ موصوف نے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے عربی زبان وادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور اسلامیات کا بھی اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ وہ 'مسلم سماج میں رسم و رواج اور اسلامی تعلیمات' کے موضوع پر کام کررہے ہیں۔

☆ ادارہ کے توسیعی خطبات پروگرام کے تحت ۲۲/جنوری ۲۰۱۱ء کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ناظم دینیات ڈاکٹر مفتی محمد زاہد علی خاں نے 'عالمی مذاہب کے مابین مکالمہ' کے موضوع پر توسیعی خطبہ پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت جماعت اسلامی ہند کے سابق امیر اور ادارہ کی مجلس منتظمہ کے رکن پروفیسر محمد عبدالحق انصاری نے کی۔ مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ واساتذہ کے علاوہ دیگر علم دوست حضرات نے شرکت کی۔

☆ ادارہ کی مجلس منتظمہ کے اجلاس منعقدہ ۱۹/جنوری ۲۰۱۲ء میں نئی میقات کے لیے ذمہ داران کا انتخاب عمل میں آیا۔ چنانچہ اتفاق رائے سے مولانا سید جلال الدین عمری کو صدر، پروفیسر کے-اے- صدیق حسن کو نائب صدر، ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی کو سکریٹری اور ڈاکٹر محمد رفعت کو خازن منتخب کیا گیا۔

☆ سکریٹری ادارہ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی نے متحدہ عرب امارات کا دس روزہ (۲۲/ فروری تا ۳/ مارچ ۲۰۱۲ء) دورہ کیا۔ اس دورہ میں انھوں نے ادارہ کے بہی خواہوں سے ملاقات کی اور اس کی علمی سرگرمیوں کا تعارف کرایا۔

☆ تحقیقات اسلامی کی ویب سائٹ www.tahqeeqat.net کے نام سے کام کررہی ہے۔ اس پر مجلّہ کے تمام شمارے اپ لوڈ ہیں۔ اب تک تقریباً اٹھارہ ہزار افراد نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ ویب ماسٹر جناب محمد عرفان (جدہ) نے ۲۰۱۲ء کے اوائل سے اس کی نئی ڈیزائننگ کی ہے، جس سے اس کی پیش کش مزید دیدہ زیب ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

R.No. 38933/81 Quartely Mob. 09897655171
Tahqeeqat-e-Islami Phone: 0571-2902034
April.....2012 Aligarh June.....2012

مولانا سید جلال الدین عمری کی مطبوعات

شمار	نام کتاب	قیمت	شمار	نام کتاب	قیمت
۱	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	۱۴۰/	۲۰	دولت میں خدا کا حق	۱۰/
۲	اسلام-انسانی حقوق کا پاسبان	۵۵/	۲۱	انفاق فی سبیل اللہ	۲۰/
۳	غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	۴۵/	۲۲	انسان اور اس کے مسائل	۴۰/
۴	کم زور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں	۳۵/-۵۰/	۲۳	اسلام اور مشکلات حیات	۲۰/۲۵
۵	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	۲۰۰/	۲۴	خدا کی غلامی-انسان کی معراج	۱۰/
۶	خدا اور رسول کا تصور-اسلامی تعلیمات میں	۸۰/	۲۵	اسلام اور وحدت بنی آدم	۶/
۷	معروف و منکر	۸۵/	۲۶	اسلام میں خدمت خلق کا تصور	۱۱۰/
۸	اسلام کی دعوت	۱۴۰/	۲۷	انسانوں کی خدمت-اسلام کی نظر میں	۱۰/
۹	اسلام-ایک دین کی دعوت	۸/	۲۸	جماعت اسلامی ہند-پس منظر، خدمات اور طریقۂ کار	۱۵/
۱۰	ہندوستان میں اسلام کی دعوت-اہمیت اور تقاضے	۵/	۲۹	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	۶/
۱۱	دعوت و تربیت-اسلام کا نقطۂ نظر	۵۰/	۳۰	ملک و ملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	۳۰/
۱۲	قرآن مجید کا تصور تزکیہ	۱۲/	۳۱	یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟	۲۰/
۱۳	عورت-اسلامی معاشرے میں	۱۶۰/	۳۲	وقت حساب	۱۰/
۱۱۴	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	۸۰/	۳۳	آخرت کے عذاب سے خاندان کو بچائیے	۱۰/
۱۵	عورت اور اسلام	۶۰/-۳۵/	۳۴	اسلام کا شورائی نظام	
۱۶	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	۱۵/	۳۵	فقہی اختلافات کی حقیقت	۱۰/
۱۷	اسلام کا عائلی نظام	۸۵/	۳۶	بعض اہم اسلامی اصطلاحات کی تشریح	۱۲/
۱۸	بچے اور اسلام	۵/	۳۷	سوئے حرم چلا	۱۵/
۱۹	تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث	۱۰۰/	۳۸	دینی علوم کی تدریس	۱۲/

ملنے کے پتے:

۱- ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، نئی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ ۲

۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی-۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵